جلد ۸۴ فروری سنہ ۱۹۷۶ء عدد ۶
298

ماھنامہ

# ترجمان القرآن

مُرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

# تفہیم القرآن

## کے

## نئے ایڈیشن

طبع ہو کر آ گئے ہیں۔ قارئین کرام و ایجنٹ حضرات آج ہی اپنے آرڈر سے

مطلع فرمائیں

| | |
|---|---|
| ہدیہ تفہیم القرآن جلد اوّل | -/۳۸ روپے |
| 〃 جلد دوم | -/۴۲ 〃 |
| 〃 جلد سوم | -/۴۵ 〃 |
| 〃 جلد ششم | -/۳۸ 〃 |

ادارہ ترجمان القرآن ۔ اِچھرہ ۔ لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ، ۴۱۱۰۱۷

ترجمان القرآن لاہور

# فہرست مضامین

| جلد ۸۴ | فروری ۱۹۷۶ء مطابق صفر ۱۳۹۶ھ | عدد ۶ |
|---|---|---|




ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

فون نمبر: ۴۱۱۰۱۶ — ۴۱۱۰۱۷

زرسالانہ بارہ روپیہ - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

دورِ جدید میں مادہ پرستانہ فلسفۂ حیات نے لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویوں کو جس انداز سے بدلا ہے اس سے نہ صرف بعض الفاظ اور محاورات کے مفہوم بدل گئے ہیں بلکہ ان کی اہمیت کے مدارج اور ان کے مطالب و معانی کے دائروں میں بھی اچھا خاصہ تغیّر رونما ہوا ہے۔ چنانچہ روزمرّہ کے وہ الفاظ جو اپنے اندر کوئی خاص معنویت نہ رکھتے تھے وہ اب اس بنا پر اصطلاحات کا روپ دھارنے لگے ہیں کہ ان میں مادی فلسفۂ حیات کی روح کارفرما نظر آتی ہے، یا اُن الفاظ کی اہمیت بڑھنے لگی ہے جو کسی اعتبار سے مادی اندازِ فکر کے ترجمان دکھائی دیتے ہیں، یا عام الفاظ میں بالکل مصنوعی طریق سے مادیت کا رنگ بھرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہمارے اس دور میں وہ الفاظ جنہیں مادی نقطۂ نظر کی وجہ سے اصطلاحات کا درجہ حاصل ہوا ہے ان میں سماج، طبقہ، کشمکش، حقوق، محنت کش، سرمایہ داری اور اسی نوع کے دیگر الفاظ شامل ہیں۔ دوسرے زمرے میں تجربہ، مشاہدہ، عقل، آفاق جیسے متعدد الفاظ آتے ہیں۔ وہ الفاظ جنہیں کھینچ تان کر مادی اندازِ فکر کا ترجمان بنایا جارہا ہے ان کی فہرست سب سے طویل ہے۔ ظلم، استبداد، مساوات، استحصال اور اسی نوع کے لاتعداد الفاظ ایسے ہیں جن کے سُنتے ہی انسان کے ذہن میں مادی تصورات گھومنے لگتے ہیں۔ مثلاً آج ہم جب لفظ "ظلم" سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہی ایک خیال اُبھرتا ہے کہ کسی فرد یا گروہ کے ساتھ تقسیمِ دولت کے معاملہ میں ظلم ہو رہا ہے، درآنحالیکہ ظلم کی بے شمار صورتیں ہیں اور وہ اس معاشی ظلم سے کہیں زیادہ روح فرسا ہوتی ہیں۔ مادی افکار کی یلغار نے ان الفاظ کا اس طرح حلیہ بگاڑا ہے کہ بسا اوقات خالص روحانی اور پاکیزہ اصطلاحات بھی صرف معیشت اور مادیت کی شارح و ترجمان نظر آتی ہیں۔ مثلاً آپ "مساواتِ محمدیؐ" کے نعرہ کو لیں اور دیانتداری سے غور کریں کہ کیا اس نعرہ کو سُن کر انسان کے ذہن میں صرف یہی ایک تصوّر نہیں اُبھرتا کہ کسی معاشرہ میں معاشی اعتبار سے جو اُونچ نیچ پائی جاتی ہے، وہ ختم ہو اور مساواتِ شکم کی بنیاد پر اس معاشرے کی تعمیرِ نو

کی جائے؟ انسانوں کے مابین مساویانہ اور عادلانہ برتاؤ صرف زندگی کے ایک شعبہ ہی میں درکار نہیں ہوتا بلکہ انسان زندگی کے ہر شعبہ میں اِس سلوک کا اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہے لیکن ماہرینِ فن نے اس اصطلاح میں مادیت کے ایسے شوخ رنگ بھر دیے ہیں کہ ایک انسان کو یہ اصطلاح "مساواتِ شکم" کے ہم معنی دکھائی دیتی ہے۔

---

اِسی طرح آپ "نظام ربوبیت" پر غور کریں۔ یہ اصطلاح اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک دینی اصطلاح ہے اور اسے سُن کر کسی سلیم الفطرت انسان کے ذہن میں اسلامی نظام کا نقش ہی اجاگر ہوتا ہے کیونکہ کائنات کے خالق نے انسان کی ساری احتیاجات کا بطریقِ احسن انتظام کر رکھا ہے۔ اُس ذات نے ایک طرف اگر انسان کی مادی احتیاجات کی تسکین کے لیے ذرائع و وسائل مہیا کیے اور ضابطے مقرر فرمائے ہیں تو دوسری طرف انسان کی روحانی پیاس بُجھانے اور اُس کے اخلاقی احساسات کو زندہ رکھنے کا بھی پورا پورا التزام کیا ہے لیکن مادی فلسفۂ حیات خصوصاً اشتراکیت کے زیرِ اثر اس مقدس اصطلاح کو اس طرح بگاڑا گیا ہے کہ اسے سُنتے ہی انسان کے ذہن میں ایک ایسے نظام کا تصور آتا ہے جس میں انسانوں کا ایک محدود سا گروہ مرکزِ ملت کے نام پر نہ صرف کسی ملک کے وسائلِ رزق پر قابض ہو، بلکہ اس کے سیاہ و سفید کا بھی پوری طرح مالک ہو اور پھر وہ اپنی صوابدید کے مطابق عوام کو روٹی کے نوالے تقسیم کرے۔ کیا اس اصطلاح کے پردے میں اشتمالیت کا پرچار نہیں کیا جا رہا؟ یہ اصطلاح جب جدید مفہوم کے ساتھ سامنے آتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے غالباً وضع ہی اس غرض کے لیے کیا گیا ہے کہ دنیا کو یہ باور کرایا جائے کہ کسی ملک کے وسائلِ معیشت پر حکومت کی مکمل اجارہ داری صرف اشتراکیت کا ہی طرۂ امتیاز نہیں بلکہ اسلام بھی اسی قسم کے جابرانہ نظام کا علمبردار ہے۔

---

ان اصطلاحات کے علاوہ بعض الفاظ کو مادیت کے پسِ منظر میں رکھ کر ایسے نئے مفاہیم کے ساتھ سامنے لایا جا رہا ہے کہ ان کے اور مادی پس منظر کے مابین پوری طرح مطابقت نظر آئے۔ اِس نوعیت کی علمی عیاری کی یوں تو متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر ان صفحات میں ہم صرف ایک لفظ "تجربہ" کو لیتے ہیں۔ یہ لفظ بظاہر کس قدر سادہ اور مفہوم کے لحاظ سے کس قدر آسان ہے لیکن مادی فلسفۂ حیات نے اس لفظ کے مفہوم اور مدعا کو جس انداز سے تبدیل کیا ہے اور پھر اس معصوم سے لفظ کی آڑ میں انسانیت کو جن ہولناکیوں سے دوچار کیا ہے

اس کے تصور سے انسانی رُوح لرز جاتی ہے۔

---

لفظ تجربہ جب کسی شخص کی زبان سے ادا ہوتا ہے تو یہی ایک مفہوم سامنے آتا ہے کہ کوئی ایسا کام جس سے کسی چیز کی ماہیت، یا اس کا اصول یا اثر معلوم کیا جا سکے یا کسی شے کی آزمائش، جانچ اور پرکھ کرنے کا طریقہ۔ اس لفظ کو دَورِ جدید سے پہلے کبھی وحی کا نقیض تصور نہیں کیا گیا تھا بلکہ اسے وحی کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات کی صحت منکرینِ وحی پر ثابت کرنے کا مؤثر طریقہ سمجھا گیا ہے مگر آج مادیت کے علمبردار دانشوروں کی کاوشوں کی وجہ سے یہ لفظ وحی اور الہام کی ضد بن کر رہ گیا ہے اور انسان اس نہج پر سوچنے لگا ہے کہ تجربہ اور مشاہدہ ہی علمِ حقیقی کی اساس ہیں اور جو معلومات تجربہ اور مشاہدہ کے ذریعہ انسان کو حاصل نہ ہوں وہ محض اوہام ہیں۔

---

آگے بڑھنے سے پیشتر اس بات کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ آخر اس لفظ کو آجکل کے مادی دور میں غیر معمولی اہمیت کیوں حاصل ہوئی ہے۔ یوں تو اس کے متعدد وجوہ ہیں جن میں بعض تاریخی عوامل بھی شامل ہیں لیکن اس ضمن میں دو وجوہ خاص طور پر نمایاں ہیں۔

انسان اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے اعتبار سے ایک محدود اور حقیر سی ہستی ہے لیکن اس کے اندر جو امنگیں اُبھرتی ہیں وہ لامحدود ہوتی ہیں اور ان کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ انسان محدود قوتوں اور محدود ذرائع کے باوجود لامحدود کو سمجھنے اور اس سے تعلقِ خاطر پیدا کرنے کی شدید آرزو رکھتا ہے۔ اِس کی اس بے بسی کو قدرت نے وحی کے ذریعہ دور کیا ہے تاکہ وہ اپنی ساری حد بندیوں اور مجبوریوں کے علی الرغم ایک ایسی راہ پر گامزن ہو سکے جس سے اسے نہ صرف لامحدود کا شعور حاصل ہو بلکہ اس کے ساتھ رشتہ عبودیت بھی استوار کر سکے۔

---

قدرت کی یہ معاونت صرف فکر و جذبہ تک ہی محدود نہیں بلکہ اس نے زندگی کے عملی میدان میں بھی انسان کی اس احتیاج کو بطریقِ احسن پورا کیا ہے۔ جس خالق نے انسان کی تخلیق کی ہے اسے اپنی اس مخلوق کی فطری حد بندیوں اور مجبوریوں کا پورا علم ہے۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ اگر انسان کو زندگی کی اس رزم گاہ میں

صرف عقل کے سہارے پر چھوڑ دیا جائے تو اسے زندہ رہنے کے لیے کیا کیا دشواریاں اور مشکلات پیش آئیں گی اور اس کی زندگی کس خوفناک عذاب کی صورت میں اُس پر مسلط ہوگی ۔ اس بنا پر اُس ذات نے نبوت کی شکل میں انسان کو ایک ایسی روشنی عطا کی ہے جو اسے نہ صرف تاریکی میں بھٹکنے اور اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے محفوظ رکھتی ہے بلکہ حق و صداقت کی صاف اور روشن راہ پر گامزن رہنے کی ترغیب بھی دیتی ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اپنے مخصوص بلیغانہ انداز میں نبوت کو رحمتِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ نظر آتی ہے کہ اُس ذات نے اپنے خاص مصالح کے تحت انسان کو علم کے جو مختلف ذرائع عطا کیے ہیں وہ چونکہ محدود ہونے کی وجہ سے اشیاء اور اعمال کے روحانی اور اخلاقی پہلوؤں کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتے اس لیے انسان کی اس فطری کمزوری کو وحی کے ذریعے دُور کیا گیا ہے تاکہ اسے کسی نظریہ یا عمل کی صحت جانچنے کے لیے ہولناک تجربات سے گذرنا نہ پڑے بلکہ وحی اس کی ہر قدم پر رہنمائی کرے ۔ دورِ حاضر کے ایک نامور مفکر نے وحی کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس ذریعہ علم کو "انسانی تجربہ کی کفایت" سے تعبیر کیا ہے ۔

---

اب اگر کوئی فلسفۂ حیات اپنے سامنے یہ مقصد رکھتا ہے کہ انسان کو وحی سے بدظن کیا جائے تو اس کی سب سے زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ وحی کے مقابلہ میں تجربہ اور مشاہدہ کی اہمیت کو غیر معمولی طور پر بڑھا یا جائے اور اس کے ذہن میں یہ باطل خیال راسخ کیا جائے کہ جس چیز کی تائید تجربہ سے نہیں ہوتی وہ باطل ہے کیونکہ اگر وہ صحیح ہے تو اُس کی تائید تجربہ سے ہر حال میں ہونی چاہیے ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نوعِ انسانی کی سیاہ بختی کا آغاز ہوتا ہے ۔ تجربہ کی بنیاد حواسِ خمسہ پر ہے اور انسان کے یہ حواس اشیاء اور اعمال کے صرف مادی خواص کا ہی کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں اس لیے تجربہ سے انسان کو جو معلومات حاصل ہیں وہ مادی اعتبار سے خواہ کتنی ہی مفید اور نتیجہ خیز ہوں مگر روحانی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے کسی قدر و قیمت کی حامل نہیں ہو سکتیں ۔ انسان کا جسم بلاشبہ بعض مادی عناصر سے عبارت ہے لیکن اس میں انسانیت کا اصل جوہر جس کی بنا پر اسے "اشرف المخلوقات" قرار دیا گیا ہے وہ اس کا روحانی احساس ہے ۔ چنانچہ جب ہم تجربہ کو انسانی علم کی واحد بنیاد قرار دیتے ہیں تو ہم درحقیقت اس کے اخلاقی اور روحانی جوہر کا ابطال کرتے ہیں اور اس کے بارے میں یہ غلط نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ کائنات کی مادی قوتوں کے ہاتھ میں بے بس کھلونا ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں معاشی قوتیں ہی اس کے فکر و احساس کا ہیولیٰ تیار کرتی ہیں ۔ تجربہ چونکہ وحی و الہام اور انسان کے اخلاقی اور روحانی احساس کی نفی

کے لیے ایک کارگر ہتھیار کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے، اس لیے مادی فلسفۂ حیات کے پرستاروں نے اس لفظ کو خوب اچھالا ہے اور ایک مخصوص دائرے اور خاص حد کے اندر جو عمل خاصا مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتا تھا اُسے اُس کی فطری حدود سے نکال کر انسانیت کی تباہی کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔

---

انسان کی اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اسے زندگی کے سارے دائروں میں ایک ایسے ہتھیار سے کام لینے پر مجبور کیا جائے جو اس کے لیے کسی ایک شعبہ میں بھی پوری طرح کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس ہتھیار کے بے محابہ استعمال نے زندگی کے اندر جس قسم کی پیچیدگیاں پیدا کی ہیں اُن کا اندازہ مندرجہ ذیل مثال سے لگایا جا سکتا ہے۔

حیاتِ انسانی کا وہ گوشہ جس میں تجربہ کا ہتھیار سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے وہ پیدائشِ دولت کا شعبہ ہے۔ کیونکہ اس ہتھیار کی مدد سے ہی انسان طریقِ پیدائش کی نئی نئی گرہیں کھولنے میں کامیاب ہوا ہے اور جس کے نتیجے میں کثیر پیداواری اور زود پیداواری ممکن ہوئی ہے مگر انسان کی اس محیر العقول کامیابی نے اُس کے لیے ایسے لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں جس نے اس کی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ اسی افزائشِ دولت کا نتیجہ ہے کہ صنعتی اعتبار سے طاقتور قوموں نے کمزور ممالک کو غلام بنا کر نہ صرف ان کے باشندوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں بلکہ ان کے وسائل کو بھی بے دریغ لُوٹا ہے۔ پھر دولت پرستی کے اس جنون نے جارحانہ قوم پرستی، نسل پرستی، آمریت، اشتراکیت اور اشتمالیت جیسے ظالمانہ نظاموں کو انسانوں پر مسلط کر کے ان کی انسانیت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے، الفاظ کا کوئی ڈھانچہ اس دردناک حزنیہ کے اظہار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ ان غلط نظریات کے تلخ ثمرات ہیں کہ انسان دور دراز فاصلوں کے سمٹ جانے کے باوجود نہ صرف ایک دوسرے سے شدید بیگانگی رکھتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے ہیں۔ انسان کو مال و دولت کی جو فراوانی نصیب ہوئی ہے اُس کے پیشِ نظر اس بات کی بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ دولت کی یہ ریل پیل اُس کے لیے بہتر اور شاد کام زندگی کی ضمانت ثابت ہوگی مگر یہ اُلٹی اُس کے لیے ان گنت اور ناقابلِ برداشت مصائب کا باعث بن رہی ہے۔ اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ جس تجربہ سے انسان نے افزائشِ دولت کے ڈھنگ سیکھے ہیں وہ اس کی اخلاقی اور روحانی نشوونما کرنے میں ناکام رہا ہے۔ پھر اس معاملہ میں اس کی بے بسی اور مجبوری بھی ظاہر ہے تجربہ کی جولانگاہ صرف مادی دنیا ہے اور جو چیز اس دائرے میں نہیں آتی وہ تجربہ کی دسترس سے بھی باہر ہے

اور اگر اس معاملہ میں اُس پر انحصار کیا جائے تو انسان کی تباہی یقینی ہے۔ بقول ابن خلدون جو ترازو سونا تولنے کے لیے بنایا گیا ہے اسے اگر پہاڑوں کو تولنے کے لیے استعمال کیا جائے تو اس ترازو اور ان غلط عزائم کے حامل لوگوں کا جو حشر ہوگا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

---

"تجربہ" پر بے جا اعتماد کا دوسرا خوفناک پہلو جو انسانیت کے لیے مندرجہ بالا پہلو سے بھی کہیں زیادہ المناک اور تباہ کن ثابت ہوا ہے وہ معاشرتی زندگی میں اس کی عملداری ہے۔ دورِ جدید کا سائنسدان اپنی تجربہ گاہ میں اس بات کا پورا التزام کرتا ہے کہ کوئی جاندار شئے تو کجا کسی بے جان شئے کا بھی زیاں نہ ہو۔ وہ کم سے کم اشیاء کے استعمال سے بہتر سے بہتر نتائج حاصل کرنے کی تدابیر سوچتا ہے تاکہ اس کی محنت پوری طرح بار آور ہو۔ پھر اگر وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کسی جاندار پر تجربہ کیے بغیر وہ کوئی مفید نتائج اخذ نہیں کر سکتا تو وہ حقیر سے جانوروں پر تجربات کرتا ہے لیکن اپنے کسی تجربہ کے لیے انسان پر مشق ناز کرنے سے حتی المقدور گریز کرتا ہے۔ اسے جب دوسرے تمام ذرائع سے اپنے تجربے کی صحت کے بارے میں مکمل اطمینان ہو جاتا ہے اور وہ اس بات کا یقین کر لیتا ہے کہ اُسے اِس تجربے کی وساطت سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ انسان کے لیے کسی لحاظ سے مہلک ثابت نہ ہوں گی، اُس وقت وہ اپنی اِن تحقیقات کے نتائج سے انسانوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ بہرہ ور کرتا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ تجربات کا دلدادہ انسان جب علوم طبیعی کے معمل سے نکل کر زندگی کی معاشرتی، سیاسی اور معاشی تجربہ گاہوں میں سرگرم عمل ہوتا ہے تو نوع بشری کے بارے میں اس حزم و احتیاط کو یکسر نظر انداز کر کے ایسا عاجلانہ اور غیر ذمہ دارانہ بلکہ انسانیت کش رویہ اختیار کرتا ہے جس سے نسلِ انسانی نہایت خوفناک قسم کی ہلاکت خیزیوں سے دوچار رہتی ہے۔ عقل و دانش کے یہ جان نثار فہم و فراست کے اُونچے دعووں کے باوجود ابھی تک اس حقیقت کو سمجھ نہیں پائے کہ معاشرتی زندگی کے تجربات بڑے طویل اور صبر آزما ہوتے ہیں اور یہ تجربات اگر ناکام ہو جائیں تو انسانیت پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالٰے نے انسانوں کو ان تجربات کی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ ہم یہاں اپنی بات کی وضاحت دو تین مثالوں سے کرتے ہیں۔

---

آپ ایک ثانیہ کے لیے معاشرتی تجربات کے اثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اُن طبی اور سائنسی

تجربات کی ناکامیوں کے بے پناہ نقصانات پر غور کریں جن سے انسان کسی نہ کسی صورت میں متاثر ہوتا ہے اور پھر اس امر کا اندازہ لگائیں کہ ایک معمولی لغزش انسانیت کے لیے کس حد تک تباہ کن ثابت ہوئی ہے۔ ابھی حال ہی میں پاکستان کے اندر ادویہ کے نوعی اسمار کا تجربہ ناکام ہوا ہے۔ یہ تجربہ اگرچہ انسانی زندگی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن اُسے صحیح معنوں میں کوئی معاشرتی تجربہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا تعلق علم کے اُس شعبے سے ہے جس کے نتائج ظاہر ہونے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگتی اور جو معاشرے کے ہر فرد کو بیک وقت اپنی لپیٹ میں نہیں لیتا لیکن اس کے باوجود اس تجربے کی ناکامی سے نہ صرف کروڑوں روپے کا نقصان ہوا ہے بلکہ لاکھوں انسانوں کے لیے کسی نہ کسی صورت میں ضرر رساں ثابت ہوا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ اس سے ہزاروں جانیں بھی ضائع ہوئی ہیں تو یہ کسی طرح بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

---

اگر صرف ایک ملک کے شعبہ طب کا ایک معمولی سا تجربہ ناکام ہو کر اس ملک کے باشندوں کے لیے بہت بڑی بربادی کا باعث بن سکتا ہے تو معاشرتی تجربات جن کے نتائج صدیوں کے بعد کھل کر سامنے آتے ہیں اور جن سے معاشرے کے ہر فرد کی زندگی متاثر ہوتی ہے، ان کی تباہ کاریوں کا کس طرح صحیح طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ مثال کے طور پر قومی ملکیت کے تجربے کو ہی لیجیے۔ معاشرتی زندگی اور اس کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والے بعض مفکرین نے بےکسوں کو استحصال سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ فلسفہ پیش کیا کہ کسی معاشرہ میں فساد کی جڑ نجی ملکیت کا وجود ہے اس لیے اس بُرائی کو مٹانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ملک کی ساری املاک اور تمام وسائل رزق حکومت کی تحویل میں دے دیے جائیں اور اسے یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ جس طرح چاہے عوام کو زندہ رکھنے کا سامان کرے۔ چنانچہ اس فلسفہ کی عملی افادیت اور قومی ملکیت کی محسوس برکات کا اندازہ کرنے کے لیے روس سے اس تجربے کا آغاز کیا گیا۔ ظاہر ہے یہ ملک دوسرے ممالک کی طرح ایسے انسانوں سے آباد تھا جو اپنے مخصوص عقائد اور افکار رکھتے تھے، جن کے دنیوی اور اُخروی زندگی کے بارے میں خاص نظریات تھے، جن کی روایات اُن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئی تھیں اور جو ان عقائد اور روایات کے زیر اثر ملکیت کے بارے میں اپنے ایک الگ نقطہ نظر اور احساس کے حامل تھے۔ اس بنا پر روس کو اشتراکیت کی تجربہ گاہ بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اِس کے لیے بڑے وسیع پیمانے پر توڑ پھوڑ اور شدید نوعیت کے جبر و استبداد کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اشتراکیت کے علمبرداروں نے لاکھوں افراد کے قتل، اور کروڑوں (باقی بر صفحہ ۴۶)

# باب ۸

## دعوتِ اسلامی کو روکنے کے لیے قریش کی تدبیریں

اس بحث سے پہلے ابتدا ہی میں یہ جان لینا ضروری ہے کہ سارے قبیلۂ قریش کا رویّہ اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں یکساں نہ تھا، بلکہ لوگ مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔

ایک طبقہ شدید ترین مخالفین کا تھا جو زیادہ تر بڑے بڑے سرداروں پر مشتمل تھا۔ ابن سعد نے طبقات میں ان لوگوں کے نام لکھے ہیں: ابوجہل، ابولہب، اَسْوَد بن عبدِ یَغُوث (یہ بنی زُہرہ میں سے، حضورؐ کا ماموں زاد بھائی تھا)۔ حارث بن قیس بن عَدِی (جو بنی سَہم میں سے تھا اور ابن الغَیطلہ کے نام سے مشہور تھا)، ولید بن مُغیرہ (بنی مَخزوم میں سے)، اُمَیَّہ بن خَلَف اور اُبَیّ بن خَلَف (بنی جُمَح میں سے)، ابوقیس بن فاکِہ بن مُغیرہ (بنی مخزوم میں سے)، عاص بن وائل سَہمی (یہ عَمرو بن العاص کا باپ تھا)، نَضر بن الحارث (بنی عبد الدار میں سے)، مُنَبِّہ بن الحجّاج (بنی سَہم میں سے)، زُہیر بن ابی امیّہ (بنی مخزوم میں سے۔ یہ ام سلمہؓ کا باپ شریک بھائی تھا)، سائب بن صَیفی بن عابد (بنی مخزوم میں سے)، اَسوَد بن عبد الاسد مخزومی، عاص بن سعید بن العاص (بنی امیہ میں سے)، ابوالبَختَری عاص بن ہشام (بنی اسد میں سے)، عُقبہ بن ابی مُعَیط (بنی امیّہ میں سے)، ابن الاَصْدیٰ (یا الاصداء) الہُذَلی، حَکَم بن ابی العاص (بنی امیّہ میں سے، یہ مروان کا باپ تھا)، عَدِیّ بن حَمراء الثَّقَفی۔

دوسرا طبقہ ان بہت سے سردارانِ قریش کا تھا جو دشمن تو ضرور تھے، مگر ایسے دشمن نہ تھے کہ مقدّم الذکر گروہ کی طرح ہاتھ دھو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے ہوں۔ البتہ اسلام کے خلاف جو کارروائیاں کی جاتی تھیں ان میں وہ دشمنوں کا ساتھ دیتے تھے۔ ابن سعد نے عُتبہ بن ربیعہ اور شَیبہ بن رَبیعہ (بنی عبد شمس بن مَناف میں سے) اور ابوسفیان بن حرب (بنی امیّہ میں سے) کو ایسے ہی دشمنوں میں شمار کیا ہے۔ تاہم جو کم سے کم مخالف تھے ان کا طرزِ عمل بھی قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ (ہود-۵) "دیکھو، یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ اس سے چھپ جائیں"۔ یعنی یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے ایسے بیزار ہیں کہ آپ سے کتراتے ہیں، کہیں آپ کو بیٹھے دیکھتے ہیں تو اُلٹے پھر جاتے ہیں، کبھی آپ کو سامنے

سے آتے دیکھتے ہیں تو رُخ بدل لیتے یا کپڑے کی اوٹ میں منہ چھپا لیتے ہیں، تاکہ آمنا سامنا نہ ہو جائے اور آپ انہیں مخاطب کر کے کچھ بات نہ کرنے لگیں۔

رہے عام اہل مکہ، تو ان میں سے کچھ غیر جانبدار تھے، کچھ دلوں میں اسلام کے قائل ہو گئے تھے مگر اپنا اسلام چھپائے ہوئے تھے، کچھ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے، اور ایک بڑی تعداد اپنے سرداروں کے بھڑکانے سے دینِ آبائی کی حمیّت میں مبتلا ہو کر اُن شرارتوں میں شریک ہو جاتی تھی جو اسلام کے خلاف کی جاتی تھیں۔

اب ہم اُن تدابیر کو الگ الگ بیان کرتے ہیں جو مخالفین نے اسلام کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے اختیار کیں۔

## ۱۔ حضورؐ سے مصالحت کی کوششیں

چونکہ مخالفین حضورؐ کی غیر معمولی شخصیت اور قرآن کی بے پناہ تاثیر کو محسوس کرتے تھے، اس لیے انہوں نے بار بار یہ کوشش کی کہ آپ سے بات چیت کر کے آپ کو دین کے معاملہ میں کسی نہ کسی طرح مصالحت پر راضی کر لیں۔ اس غرض کے لیے ان کے متعدد وفود بھی آپ سے ملے اور خاص خاص اشخاص نے بھی مل کر بات کی۔

**عُتبہ بن رَبیعہ کی آپ سے ملاقات** ان ملاقاتوں میں سے ایک اہم ملاقات عُتبہ بن رَبیعہ کی تھی جس کو مختلف محدثین نے مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے، مگر ماحصل میں زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ابن عمرؓ سے اور عبد بن حُمید، ابو یعلیٰ اور بیہقی نے جابر بن عبداللہؓ انصاری سے روایت کیا ہے کہ ایک روز قریش کے کچھ لوگ جمع ہوئے اور انہوں نے آپس میں کہا کہ دیکھو، تم میں کون سب سے زیادہ سحر، کہانت اور شعر کا جاننے والا ہے۔ وہ اِس شخص کے پاس جائے جس نے ہماری جماعت میں پھوٹ ڈال دی ہے، ہمارے معاملات میں خرابی برپا کر دی ہے اور ہمارے دین کو عیب لگایا ہے، اور اس سے بات کر کے دیکھے کہ وہ کیا جواب دیتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ ایسا آدمی ہمارے نزدیک عُتبہ بن ربیعہ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ سب نے کہا ابو الولید، تم یہ کام کرو، اور وہ آپ کے پاس گیا۔

دوسری روایت محمد بن اسحاق اور بیہقی نے محمد بن کعب القُرظی سے نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک دفعہ قریش کے کچھ سردار مسجد حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے ایک دوسرے گوشے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا تشریف رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہؓ ایمان لا چکے تھے اور قریش کے لوگ مسلمانوں کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اس موقع پر عُتبہ بن رَبیعہ (ابو سفیان کے خُسر) نے سردارانِ قریش

نے کہا کہ صاحبو! اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں، شاید کہ وہ ان میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کر لیں اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آجائیں۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ "ابوالولید، تم پر پورا اطمینان ہے، ضرور جا کر اس سے بات کرو۔" عتبہ اٹھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا بیٹھا۔ آپؐ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا "بھتیجے، ہمارے ہاں تم کو جو عزت حاصل تھی وہ تم خوب جانتے ہو۔ اور نسب میں بھی تم ایک شریف ترین گھرانے کے فرد ہو۔ تم اپنی قوم پر یہ کیا مصیبت لے آئے ہو؟ تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بے وقوف ٹھیرایا۔ قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی برائی کی اور ہمارے باپ دادا جو مر چکے ہیں، ان سب کو تم نے کافر اور گمراہ ٹھیرایا۔ اب ذرا میری بات سنو۔ میں کچھ تجویزیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں۔ ان پر غور کرو۔ شاید کہ ان میں سے کسی کو تم قبول کر لو۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابوالولید، آپ کہیں، میں سنوں گا۔ اس نے کہا "بھتیجے یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے، اس سے اگر تمہارا مقصد مال حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تم کو اتنا کچھ دیے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں، کسی معاملے کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اور اگر تم پر کوئی جن آتا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو اور تمہیں سوتے یا جاگتے میں واقعی کچھ نظر آنے لگا ہے تو ہم بہترین اطباء بلواتے ہیں اور سب مل کر اپنے خرچ پر تمہارا علاج کراتے ہیں۔" عتبہ یہ باتیں کرتا رہا اور حضورؐ خاموش سنتے رہے۔ پھر آپ نے فرمایا "ابوالولید، آپ کو جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے یا ابھی اور کچھ کہنا ہے؟" اس نے کہا "بس جو کچھ کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا"۔ آپ نے فرمایا "اچھا، اب میری سنیے"۔ اس کے بعد آپؐ نے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر سورۂ حٰمٓ السجدہ کی تلاوت شروع کی اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ آیتِ سجدہ (آیت ۳۸) پر پہنچ کر آپؐ نے سجدہ کیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا، "ابوالولید، میرا جواب آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام"۔ عتبہ اٹھ کر سردارانِ قریش کی مجلس کی طرف چلا تو لوگوں نے دور سے اس کو دیکھتے ہی کہا، خدا کی قسم عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے، یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر یہ گیا تھا۔ پھر جب وہ آکر بیٹھا تو لوگوں نے کہا، کیا سن آئے؟ اس نے کہا، "بخدا، میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا۔ خدا کی قسم، نہ یہ شعر ہے، نہ سحر ہے نہ کہانت۔ اے اہلِ قریش، میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو، اگر عرب اس پر غالب آگئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے

سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے۔ لیکن اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی اور اس کی عزت تمہاری عزت ہی ہوگی۔" سردارانِ قریش اس کی یہ بات سنتے ہی بول اٹھے "ولید کے ابا، آخر اس کا جادو تم پر بھی چل گیا۔" عتبہ نے کہا، میری جو رائے تھی وہ میں نے تمہیں بتا دی، اب تمہارا جو جی چاہے کرتے رہو۔"

بیہقی نے اس واقعہ کے متعلق جو روایات جمع کی ہیں ان میں یہ اضافہ ہے کہ جب آپؐ سورۂ حٰم السجدہ کی آیت ۱۳ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ (اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں نے تم کو اُسی طرح کے اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈرا دیا ہے جیسا عاد و ثمود پر نازل ہوا تھا) پر پہنچے تو عتبہ نے بے اختیار آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہنے لگا کہ "ایسی بات نہ کہو۔" اور اپنی اس حرکت کا سبب اس نے لوگوں کو یہ بتایا کہ "تم لوگ جانتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جب کوئی بات کہتے ہیں تو وہ جھوٹی نہیں ہوتی، اس لیے مجھے عذاب کا خوف ہوا۔"

**ایک اور وفد کی ملاقات** محمد بن اسحاق ابن عباسؓ کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ عُتبہ بن رَبیعہ، شَیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان بن حرب، نضر بن حارث، ابوالبختری بن ہشام، اسود بن المطّلب، زمعہ بن الاسود، ولید بن مغیرہ، ابوجہل، عبداللہ بن ابی امیہ، اُمیہ بن خلف، عاص بن وائل اور حجاج سہمی کے بیٹے نُبیہ اور مُنبہ غروب آفتاب کے بعد کعبہ کی دیوار کے پاس جمع ہوئے اور آپس میں کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بلا کر بات کرو اور ان سے بحث کر کے اپنی حجت پوری کر دو۔ چنانچہ حضورؐ کو پیغام بھیجا گیا کہ آپ کی قوم کے اشراف جمع ہوئے ہیں تاکہ آپ سے بات کریں۔ حضورؐ چونکہ ان لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے خود بے چین تھے اس لیے آپ فوراً تشریف لے آئے۔ ان لوگوں نے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، ہم نے تم کو اس لیے بلایا ہے کہ تمہارے معاملہ میں اپنی طرف سے حجت پوری کر دیں۔ واللہ، ہم نہیں جانتے کہ عرب میں سے کسی شخص نے اپنی قوم میں وہ فتنہ ڈالا ہو جو تم نے اپنی قوم میں ڈالا ہے۔ تم نے باپ دادا کو برا کہا، دین میں عیب نکالا، لوگوں کو بے وقوف ٹھیرایا، معبودوں کی برائی کی، جماعت میں پھوٹ ڈالی دی، اور کوئی قبیح بات ایسی نہ رہی جو تم ہمارے اور اپنے درمیان نہ لے آئے۔ اگر تم یہ سب کچھ مال کی طلب میں کر رہے ہو تو ہم اپنے مال جمع کر کے تم کو اتنا دے دیں گے کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ۔ اگر تم ہم میں اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں (ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ حتیٰ کہ ہم کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے)۔ اور اگر تم بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تم کو بادشاہ بنائے لیتے

ہیں۔ لیکن اگر یہ کوئی جن تم پر آتا ہے جو تم پر مسلط ہو گیا ہے تو ہم اپنے مال صرف کر کے تمہارے علاج کا بندوبست کرتے ہیں تاکہ تم اس کی گرفت سے چھوٹ جاؤ، یا کم از کم ہماری طرف سے عذر پورا ہو جائے۔" جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ "مجھے وہ کوئی مرض لاحق نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ نہ میں جو چیز تمہارے پاس لایا ہوں وہ اس لیے لایا ہوں کہ تم سے تمہارے مال طلب کروں، یا تم میں شرف حاصل کروں، یا تمہارا بادشاہ بن جاؤں۔ بلکہ اللہ نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ پر ایک کتاب نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے لیے بشیر (ایمان لانے پر خوشخبری دینے والا) اور نذیر (ایمان نہ لانے پر ڈرانے والا) بنوں۔ چنانچہ میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیے اور تمہیں نصیحت کر دی۔ اب اگر تم اُس چیز کو قبول کر لو جو میں تمہارے پاس لایا ہوں تو وہ تمہارے لیے دنیا اور آخرت میں خوش نصیبی ہے۔ اور اگر اسے رد کرتے ہو تو میں اللہ کے حکم پر صبر کروں گا یہاں تک کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔" اس پر کفار کے سرداروں نے حضورؐ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کیا (جن کا ذکر جگہ جگہ قرآن مجید میں کیا گیا ہے اور جن کا جواب بھی قرآن مجید میں دے دیا گیا ہے[1] اس لیے یہاں ہم ان کو درج نہیں کر رہے ہیں)۔ ابن ہشام نے ابن اسحاق سے اس واقعہ کی جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ اضافہ ہے کہ معجزات کے یہ مطالبے سُن کر حضورؐ نے فرمایا "میں ان کاموں کے لیے تمہارے پاس نہیں بھیجا گیا ہوں۔ میں نے وہ باتیں تمہارے سامنے پیش کر دی ہیں جن کے لیے مجھے اللہ نے بھیجا ہے۔" آخر کار ان لوگوں نے حضورؐ کو یہ دھمکی دی کہ "واللہ، ہم تم کو اور تمہاری اِن کارروائیوں کو جو تم ہمارے درمیان کر رہے ہو یونہی نہیں چھوڑ دیں گے تا آنکہ یا ہم تمہیں ختم کر دیں یا تم ہمیں ختم کر دو۔"

**مصالحت کی چند اور کوششیں** اس کے علاوہ بھی متعدد مواقع پر قریش کے سردار حضورؐ کے سامنے متعدد تجویزیں پیش کرتے رہے کہ آپ کسی بات پر راضی ہو جائیں اور آپ کی اور ان کی کشمکش ختم ہو جائے۔

---

[1] مثال کے طور پر قرآن میں فرمایا گیا: وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِي قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ (الانعام آیت ۷) "اگر ہم تیرے اُوپر کاغذ میں لکھی ہوئی کوئی کتاب نازل کر دیتے اور یہ لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تو جن لوگوں نے نہیں مانا وہ کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔" وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ (الحجر آیت ۱۴-۱۵) "اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور یہ اس میں چڑھنے لگتے تو یہ کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔"

حضرت عبداللہؓ بن عباس کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ "ہم آپ کو اتنا مال دیے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ مال دار آدمی بن جائیں، آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کیے دیتے ہیں، ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی بُرائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں، تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی"۔ حضورؐ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا "ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عزّٰی کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں"۔ حضورؐ نے فرمایا "اچھا ٹھیرو، میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے"[۱]۔ اس پر وحی نازل ہوئی قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ، لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ۔ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ۔ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ۔ "کہدو کہ اے کافرو، میں اُن کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو اور نہ تم اُس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اور نہ میں اُن کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین"۔ اور یہ کہ قُلْ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُونِّي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ (الزمر آیت ۶۴) "اِن سے کہو اے نادانو، کیا تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کروں"؟ (ابن جریر (فی التفسیر والتاریخ)، ابن ابی حاتم۔ طبرانی)۔

ابن عباس کی ایک اور روایت یہ ہے کہ قریش کے لوگوں نے حضورؐ سے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، اگر تم ہمارے معبودوں کو چوم لو تو ہم تمھارے معبود کی عبادت کریں گے۔ اِس پر سورۂ کافرون نازل ہوئی (عبد بن حُمَید)۔

---

[۱] اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی درجہ میں بھی اِس تجویز کو قابلِ قبول کیا معنی قابلِ غور بھی سمجھتے تھے، اور آپ نے معاذ اللہ کفار کو یہ جواب اِس امید پر دیا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی منظوری آجائے، بلکہ دراصل یہ بات بالکل ایسی ہی تھی جیسے کسی ماتحت افسر کے سامنے کوئی بے جا مطالبہ پیش کیا جائے اور وہ جانتا ہو کہ اس کی حکومت کے لیے یہ مطالبہ قابلِ قبول نہیں ہے، مگر وہ خود صاف انکار کر دینے کے بجائے مطالبہ کرنے والے سے کہے کہ میں آپ کی درخواست اُوپر بھیجے دیتا ہوں، جو کچھ وہاں سے جواب آئے گا وہ آپ کو بتا دوں گا۔ اس سے فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ ماتحت افسر اگر خود ہی انکار کر دے تو لوگوں کا اصرار جاری رہتا ہے، لیکن اگر وہ بتائے کہ اُوپر سے حکومت کا جواب ہی تمھارے مطالبے کے خلاف آیا ہے تو لوگ مایوس ہو جاتے ہیں۔

سعید بن مِینا (ابو البَختَری کے آزاد کردہ غلام) کی روایت ہے کہ ولید بن مُغیرہ، عاص بن وائِل، اَسوَد بن المُطَّلِب اور اُمَیَّہ بن خَلَف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور آپ سے کہا "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، آؤ ہم تمہارے معبود کی عبادت کرتے ہیں اور تم ہمارے معبودوں کی عبادت کرو اور ہم اپنے سارے کاموں میں تمہیں شریک کیے لیتے ہیں۔ اگر وہ چیز جو تم لے کر آئے ہو اُس سے بہتر ہوئی جو ہمارے پاس ہے تو ہم تمہارے ساتھ اس میں شریک ہوں گے اور اپنا حصہ اس سے پالیں گے۔ اور اگر وہ چیز جو ہمارے پاس ہے اس سے بہتر ہوئی جو تم لائے ہو تو تم ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گے اور اس سے اپنا حصہ پالو گے۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی کہ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ (ابن جریر۔ ابن ابی حاتم۔ ابن ہِشام اور بَلاذُری نے بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے)

وَہب بن مُنَبِّہ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہو جائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہو جایا کریں، (عبد بن حُمَید، ابن ابی حاتم)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہی مجلس میں نہیں بلکہ مختلف اوقات میں مختلف مواقع پر کفارِ قریش نے حضورؐ کے سامنے اِس قسم کی تجویزیں پیش کی تھیں اور اس بات کی ضرورت تھی کہ ایک دفعہ دو ٹوک جواب دے کر اُن کی اِس امید کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے معاملہ میں کچھ دو اور کچھ لو کے طریقے پر ان سے کوئی مصالحت کر لیں گے۔

## ۲- جناب ابو طالب پر دباؤ ڈالنے کی کوششیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو روکنے کے لیے قریش کی دوسری تدبیر یہ تھی کہ پے درپے ابو طالب سے مل کر ان پر بھی دباؤ ڈالیں کہ وہ آپ کی حمایت چھوڑ دیں، اور ان کے ذریعہ سے حضورؐ پر بھی دباؤ ڈلوائیں کہ آپ اپنے کام سے باز آ جائیں۔

**پہلا وفد** محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ قریش نے جب دیکھا کہ ابو طالب حضورؐ کی حمایت کر رہے ہیں اور آپ کو اُن باتوں سے نہیں روکتے جو انہیں سخت ناگوار ہیں تو اشرافِ قریش کا ایک وفد ان کے پاس گیا جس میں بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے عُتبہ بن ربیعہ اور شَیبہ بن ربیعہ، بنی اُمیہ میں سے ابو سفیان، بنی اَسَد بن عبد العُزّٰی میں سے ابو البَختَری عاص بن ہِشام اور اَسوَد بن المطّلِب، بنی مَخزُوم میں سے ابو جہل اور ولید بن مُغیرہ، بنی سَہم میں سے حَجّاج کے بیٹے نُبَیہ اور مُنَبِّہ اور عاص بن وائل شامل تھے۔ انہوں نے کہا کہ "اے ابو طالب آپ کے بھتیجے نے ہمارے معبودوں

کی بُرائی کی، ہمارے دین میں عیب نکالا، ہماری عقلوں کو حماقت قرار دیا، ہمارے باپ دادا کو گمراہ ٹھیرایا۔ اب یاتو آپ اُسے ہماری دل آزاری سے روکیں، یا ہمارے اور اُس کے درمیان سے ہٹ جائیں، کیونکہ آپ خود بھی تو ہماری طرح اُس کے لائے ہوئے دین کے خلاف ہیں۔ پھر ہم اُس سے نمٹ لیں گے"۔ ابوطالب نے ان کو بہت نرم جواب دے کر اور اچھی اچھی باتیں کر کے ٹھنڈا کیا اور وہ چلے گئے (ابن ہشام۔ طبری۔ البدایہ والنہایہ)۔

**دوسرا وفد**

پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کام جاری رکھا اور قریش کے سردار اس پر اُونٹتے رہے تو آخر ان سے صبر نہ ہوسکا اور ایک دوسرا وفد لے کر وہ ابوطالب کے پاس گئے اور کہا کہ "اے ابوطالب، آپ ہمارے درمیان سن رسیدہ بزرگ ہیں، شرف اور قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ آپ اُس کی حمایت سے باز آجائیں، مگر آپ باز نہ آئے۔ ہم سے اپنے باپ دادا کی بُرائی اور اپنی عقلوں کی توہین اور اپنے معبودوں کی عیب چینی برداشت نہیں ہوسکتی۔ اب یا تو آپ اُسے روکیں، یا پھر ہمارا اور آپ کا مقابلہ ہوگا یہاں تک کہ فریقین میں سے کوئی ایک ہلاک ہوجائے"۔ اس کے بعد روایات میں اختلاف ہے۔

امام بخاریؒ نے تاریخ میں اور حافظ ابویعلیٰ نے اپنی مُسند میں عَقیل بن ابی طالب کی جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ ہے کہ ان لوگوں کی موجودگی ہی میں میرے والد نے مجھ سے کہا کہ جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بلا لاؤ۔ میں سخت گرمی میں ان کو تلاش کر کے لے آیا۔ آپ تشریف لائے تو ابوطالب نے کہا کہ "بھتیجے تمہارے بنی عم مجھ سے تمہارے متعلق یہ شکایت کر رہے ہیں کہ تم انہیں ان کی مجلسوں میں اور مسجد (یعنی مسجد حرام) میں اذیت دیتے ہو۔ تم ان کو اذیت دینا بند کر دو"۔ اس پر حضورؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی اور قریش کے سرداروں سے فرمایا آپ لوگ یہ سورج دیکھ رہے ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا "یہ سورج جس طرح آپ لوگوں سے اپنے شعلے روک دینے پر قادر نہیں اُسی طرح میں بھی اس کام کو چھوڑ دینے پر قادر نہیں ہوں"۔ یہ جواب دے کر آپ اُٹھ گئے اور آپ کے جانے کے بعد ابوطالب نے کہا میرے بھتیجے نے کبھی کوئی جھوٹی بات نہیں کہی ہے، لہٰذا آپ لوگ تشریف لے جائیں۔ طبرانی نے اوسط اور کبیر میں بھی یہ روایت نقل کی ہے اور ابویعلیٰ نے بھی اختصار کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔

ابن ہشام، طبری، بیہقی اور بلاذری نے یہ واقعہ اس طرح نقل کیا ہے کہ ان لوگوں کے جانے کے بعد ابوطالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بُلا کر کہا "بھتیجے تمہاری قوم نے آکر مجھ سے یہ یہ باتیں کہی ہیں۔ تم میرے لیے بھی اور اپنے لیے بھی جینے کی کچھ گنجائش باقی رہنے دو اور مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ نہ میں اسے اُٹھا سکوں اور نہ تم اُٹھا سکو۔ لہٰذا اپنی قوم سے ایسی باتیں کہنا چھوڑ دو جو انہیں ناگوار ہیں"۔ ابوطالب کی یہ بات سن کر حضورؐ نے محسوس کیا کہ چچا کے لیے

اب میری حمایت کرنا مشکل ہو گیا ہے اور وہ اِس سے دست بردار ہونے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ تب آپ نے فرمایا "چچا جان، اگر سورج میرے سیدھے ہاتھ پر اور چاند بائیں ہاتھ پر بھی رکھ دیا جائے تو میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ یا تو اللہ اسے کامیاب فرمادے یا میں اس راہ میں ہلاک ہو جاؤں"۔ پھر آپ رنجیدہ ہو کر رو دیے اور اُٹھ کر جانے لگے۔ ابوطالب نے یہ دیکھ کر کہ حضورؐ پر اس بات کا کیسا سخت اثر ہوا ہے آپ کو پکارا۔ آپ پلٹ کر آئے تو انہوں نے کہا اپنا کام جاری رکھو اور جو کچھ کرنا چاہو کرو، خدا کی قسم میں کسی چیز کی وجہ سے بھی تمہیں دشمنوں کے حوالے نہ کروں گا۔

**ابوجہل حضورؐ کے قتل کا ارادہ کرتا ہے**

محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ ابوجہل نے قریش کے لوگوں سے کہا "اے گروہ قریش تم نے دیکھ لیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کس طرح صاف صاف کہہ دیا ہے کہ وہ ہمارے دین کی بُرائی کرنے، ہمارے باپ دادا کو گمراہ کہنے، ہماری عقلوں کو بے عقلی قرار دینے اور ہمارے معبودوں کو گالیاں دینے سے باز نہ آئیں گے اب میں اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ کل میں ایک پتھر لے کر بیٹھوں گا اور جب وہ نماز میں سجدہ کریں گے تو ان کا سر کچل دُوں گا پھر بنی عبدِ مَناف جو چاہیں کر لیں"۔ دوسرے روز صبح کو وہ پتھر لے کر آپ کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ حضورؐ حسبِ عادت تشریف لائے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ قریش کے لوگ بھی اپنی مجلسوں میں جمع ہو گئے کہ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ حضورؐ جب سجدے میں گئے تو ابوجہل پتھر لے کر آگے بڑھا، مگر یکایک وہ آپ کے قریب پہنچ کر پلٹا۔ وہ سخت خوف زدہ تھا، اُس کا رنگ فق تھا، اور پتھر بھی اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ قریش کے لوگ اُٹھ کر اس کے پاس گئے اور پوچھا ابوالحکم، یہ تمہیں کیا ہو گیا؟ اُس نے کہا "میں وہی کام کرنے کے لیے آگے بڑھا تھا جو میں تم سے کہہ چکا تھا، مگر جب میں قریب پہنچا تو میرے آگے ایک ایسا زبردست اُونٹ آگیا کہ میں نے کبھی اتنے بڑے سر اور ایسی گردن اور ایسی کچلیوں والا اُونٹ نہ دیکھا تھا۔ اور وہ مجھے چبا ڈالنے کے لیے تیار ہو گیا"۔ بعد میں حضورؐ نے فرمایا وہ جبریل تھے۔

**تیسرا وفد**

ابن سعد نے لکھا ہے کہ قریش کے شیوخ پھر ایک دفعہ ابوطالب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ آپ ہمارے بڑے اور سردار ہیں، ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرتے ہیں اور آپ بھی ہمارے اور اس کے درمیان انصاف کریں۔ اپنے بھتیجے کو بُلایئے اور اُس سے کہیے کہ وہ ہمارے معبودوں کی بُرائی چھوڑ دے اور ہم اسے اور اس کے معبود کو اس کے حال پر چھوڑے دیتے ہیں۔ اس پر ابوطالب نے حضورؐ کو بلایا اور کہا "بھتیجے، یہ تمہارے اعمام اور تمہاری قوم کے اشراف اور شیوخ آئے ہیں اور تم سے ایک انصاف کی بات طے کرنا چاہتے ہیں۔ حضورؐ نے کہا آپ لوگ فرمائیں، میں سُنتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ تم ہمیں اور ہمارے معبودوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو اور ان کی بُرائی کرنے سے

آجاؤ۔ ہم تمہیں اور تمہارے معبود کو تمہارے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ابوطالب نے کہا یہ تو انہوں نے انصاف کی بات کہی ہے اسے مان لو۔ حضورؐ نے فرمایا "چچا جان، کیا میں اس سے بہتر چیز کی طرف انہیں نہ بلاؤں؟" ابوطالب نے پوچھا وہ کیا بات ہے؟ حضورؐ نے فرمایا "میں انہیں ایک ایسے کلمے کی طرف بلاتا ہوں جس کے اگر یہ قائل ہو جائیں تو عرب کے فرمانروا بن جائیں اور عجم ان کا تابع ہو جائے"۔ ابوجہل بولا "یہ تو بڑے نفع کا سودا ہے، تمہارے باپ کی قسم ہم ایک نہیں دس ایسے کلمے کہنے کے لیے تیار ہیں"۔ حضورؐ نے فرمایا کہو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ۔ اس پر وہ سب غضبناک ہو کر نفرت کے ساتھ جھٹ گئے اور کہنے لگے اِصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِھَتِکُمْ، اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ (صٓ آیت ۶) "اپنے معبودوں کی عبادت پر ڈٹے رہو، اس بات سے تو کچھ اور ہی مراد ہے"۔

اس واقعہ کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں اور طبری نے تاریخ میں اسے زمانہ کے تعین کے بغیر بیان کیا ہے۔ ابن اسحاق نے اسے حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد کا واقعہ بیان کیا ہے اور اسی کو زمخشری، رازی اور نیشاپوری وغیرہ مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ لیکن متعدد دوسری روایات میں اسے اُس وقت کا واقعہ لکھا ہے جب ابوطالب مرض وفات میں مبتلا تھے۔ امام احمد، نسائی، ترمذی، بیہقی، ابن ابی شیبہ، ابن ابی حاتم اور ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں جو واقعہ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ابوطالب بیمار ہوئے اور قریش کے سرداروں نے محسوس کیا کہ اب یہ ان کا آخری وقت ہے تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ چل کر شیخ سے بات کرنی چاہیے۔ وہ ہمارا اور اپنے بھتیجے کا جھگڑا چکا جائیں تو اچھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کا انتقال ہو جائے اور ان کے بعد ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کوئی سخت معاملہ کریں اور عرب کے لوگ ہمیں طعنہ دیں کہ جب تک شیخ زندہ تھا، یہ لوگ اس کا لحاظ کرتے رہے۔ اب اس کے مرنے کے بعد ان لوگوں نے اس کے بھتیجے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ اس رائے پر سب کا اتفاق ہو گیا اور تقریباً ۲۵ سردارانِ قریش، جن میں ابوجہل، ابوسفیان، اُمیّہ بن خلف، عاص بن وائل، اَسوَد بن المطّلب، عُقبہ بن ابی مُعیط، عُتبہ اور شَیبہ شامل تھے، ابوطالب کے پاس پہنچے۔ ان لوگوں نے پہلے تو حسبِ معمول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی شکایات بیان کیں، پھر کہا ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرنے آئے ہیں۔ آپ کا بھتیجا ہمیں ہمارے دین پر چھوڑ دے اور ہم اسے اس کے دین پر چھوڑے دیتے ہیں۔ وہ جس معبود کی عبادت کرنا چاہے کرے، ہمیں اس سے کوئی تعرض نہیں۔ مگر وہ ہمارے معبودوں کی مذمت نہ کرے اور یہ کوشش نہ کرتا پھرے کہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ اس شرط پر آپ ہم سے اس کی صلح کرا دیں۔ ابوطالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور آپؐ سے کہا کہ بھتیجے یہ تمہاری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ایک منصفانہ بات پر ان سے اتفاق کر لو۔ تاکہ تمہارا اور

ان کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ پھر انہوں نے وہ بات حضورؐ کو بتائی جو سردارانِ قریش نے ان سے کہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا، چچا جان، میں تو ان کے سامنے ایک ایسا کلمہ پیش کرتا ہوں جسے اگر یہ مان لیں تو عرب ان کا تابع اور عجم ان کا باج گزار ہو جائے۔[1] یہ سن کر پہلے تو وہ لوگ سٹ پٹا گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر کیا کہہ کر ایسے ایک مفید کلمے کو رد کریں۔ پھر کچھ سنبھل کر بولے، تم ایک کلمہ کہتے ہو، ہم ایسے دس کلمے کہنے کو تیار ہیں، مگر یہ بتاؤ کہ وہ کلمہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ اس پر وہ سب یکبارگی اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ باتیں کہتے ہوئے نکل گئے جو سورۂ صٓ کے ابتدائی حصہ میں (آیت ۴ سے ۸ تک) بیان ہوئی ہیں۔

**چوتھا وفد** ابن ہشام، ابن جریر طبری، ابن سعد، بلاذری اور ابن کثیر نے لکھا ہے کہ قریش نے جب دیکھا کہ ابو طالب کسی طرح حضورؐ کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے اور وہ قوم کی عداوت اور اس سے جدائی تک اپنے بھتیجے کی مول لینے کو تیار ہیں تو وہ ولید بن مغیرہ کے بیٹے عمارہ بن ولید کو ان کے پاس لے گئے اور کہا کہ "اے ابو طالب عمارہ بن ولید قریش کا نہایت نام آور اور خوبصورت جوان ہے، اس کو لے کر بیٹا بنا لو اور اس کے بدلے اس بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دو جس نے تمہارے آباؤ اجداد کے دین کی مخالفت کی اور تمہاری قوم میں پھوٹ ڈال دی اور ہم سب کو احمق قرار دیا۔ ہم ایک آدمی لے کر دوسرا لیتے ہیں تاکہ اسے قتل کر ڈالیں۔" ابو طالب نے جواب دیا، "واللہ تم نے بدترین سوال مجھ سے کیا۔ اپنا بیٹا مجھے دیتے ہو کہ میں اسے پالوں، اور میرا بیٹا مجھ سے مانگتے ہو کہ تم اسے قتل کر ڈالو۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔" مُطعِم بن عَدِی نے جو ہاشم کے بھائی نوفل کی اولاد سے تھا

---

[1] حضورؐ کے اس ارشاد کو مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے: ایک روایت یہ ہے کہ آپ نے فرمایا اُرید ھم علی کلمۃ واحدۃ یقولونھا تدین لھم بھا العرب وتؤدّی الیھم بھا العجم الجزیۃ۔ دوسری روایت میں یہ ہیں: ادعوھم الی ان یتکلموا بکلمۃ تدین لھم بھا العرب ویملکون بھا العجم۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے ابو طالب کے بجائے قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا، کلمۃ واحدۃ تعطونیھا تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العجم۔ اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ارأیتکم ان اعطیتکم کلمۃ تکلمتم بھا ملکتم بھا العرب ودانت لکم بھا العجم۔ ان لفظی اختلافات کے باوجود مدعا سب کا یکساں ہے، یعنی حضورؐ نے ان سے کہا کہ اگر میں ایک ایسا کلمہ تمہارے سامنے پیش کروں جسے قبول کر کے تم عرب و عجم کے مالک ہو جاؤ گے تو بتاؤ کہ یہ زیادہ بہتر بات ہے یا وہ جسے تم انصاف کی بات کہہ کر میرے سامنے پیش کر رہے ہو؟ تمہاری بھلائی اس کلمے کو مان لینے میں ہے یا اس میں کہ جس حالت میں تم پڑے ہو اسی میں تم کو پڑا رہنے دوں اور بس اپنی جگہ آپ ہی اپنے خدا کی عبادت کرتا رہوں؟

لا اللہ اے ابو طالب تمہاری قوم نے تو تمہارے ساتھ انصاف کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ جس مشکل میں تم پڑ گئے ہو اس
ے تم نکل جاؤ۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم ان کی کوئی بات قبول نہیں کرتے"۔ ابو طالب نے جواب دیا کہ "واللہ انہوں
ے مجھ سے کوئی انصاف نہیں کیا۔ مگر تم مجھے چھوڑ کر میرے خلاف ان کا ساتھ دے رہے ہو۔ اچھا، کرو جو تمہارا
ی چاہے"۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ اس پر بات بڑھ گئی، اور لڑائی ٹھن گئی اور لوگوں نے ایک دوسرے کے مقابلے
فیصلہ کر لیا۔

طالب کا بنی ہاشم اور بنی المطلب کو جمع کرنا | ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ اس کے بعد ابو طالب نے بنی ہاشم اور بنی المطّلب کو جمع کیا اور
یں اس بات پر آمادہ کیا کہ سب متفق ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت وحفاظت کریں گے۔ اس بات کو سب
قبول کر لیا اور ابو طالب کا ساتھ دینے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ صرف ابولہب اس سے الگ رہا۔

یش کو ابو طالب کی دھمکی | ابن سعد نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت زور وشور پر ہو رہی تھی
ابھی ہجرتِ حبشہ واقع نہ ہوئی تھی، ایک روز ابو طالب اور دوسرے اہل خاندان حضورؐ کے مکان پر آئے اور آپؐ کو
ں نہ پایا۔ ابو طالب کو شبہ ہوا کہ حضورؐ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے اسی وقت بنی ہاشم اور بنی المطّلب کے نوجوانوں
مع کیا اور ان سے کہا کہ "ایک ایک خنجر یا کوئی اور ہتھیار لے کر کپڑوں میں چھپا لو اور میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ جب
مسجد حرام میں داخل ہوں تو دیکھو کہ عظمائے قریش کی کونسی مجلس میں ابن الحنظلیّہ (یعنی ابوجہل) بیٹھا ہے۔ بس
مجلس کے کسی شخص کو جیتا نہ چھوڑنا کیونکہ لامحالہ اسی پارٹی نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کیا ہوگا"۔ اس ارادہ
ے ابو طالب چلے۔ اتنے ہی حضرت زید بن حارثہؓ مل گئے اور ان سے معلوم ہوا کہ حضورؐ بخیریت ہیں۔ دوسرے
ابو طالب صبح کے وقت حضورؐ کے مکان پر آئے اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر بنی ہاشم اور بنی المطلب کے نوجوانوں سمیت
ش کے سرداروں کی مجلس میں پہنچے اور ان سے کہا کہ اے قریش کے لوگو، تمہیں کچھ معلوم ہے کہ میں نے کیا ارادہ کیا
؟ انہوں نے کہا نہیں۔ ابو طالب نے سارا ماجرا بیان کیا اور اپنے نوجوانوں سے کہا کہ ذرا اپنی چادریں ہٹاؤ۔
انہوں نے چادریں ہٹائیں تو لوگوں نے دیکھا کہ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک تیز ہتھیار ہے۔ پھر ابو طالب نے کہا
ا کی قسم، اگر تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دیا تو میں تم میں سے ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑوں گا یہاں
کہ ہم لڑ کٹ کر ختم ہو جائیں۔ اس واقعہ نے قریش کو احساس دلایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان
نہیں ہے۔ اور سب سے زیادہ ابوجہل کے لیے یہ واقعہ سخت ہمت شکن تھا۔

(باقی)

# سیرت کا پیغام

(ایک تقریر جو ۲۲ اکتوبر ۷۵ء کو پنجاب یونیورسٹی یونین کی دعوت پر یونیورسٹی کے نئے کیمپس میں کی گئی تھی)

جناب وائس چانسلر صاحب، صدرِ انجمن اتحادِ طلبہ اور طالبین و طالبات۔

مجھے دعوت دی گئی ہے کہ میں آپ کے اس اجتماع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے پیغام پر کچھ عرض کروں۔ اس مضمون پر اگر منطقی ترتیب کے ساتھ کلام کیا جائے تو سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ایک نبی کی سیرت ہی کا پیغام کیوں؟ کسی اور کا پیغام کیوں نہیں؟ اور انبیاء میں سے بھی صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت کا پیغام کیوں؟ دوسرے انبیاء اور پیشوایانِ مذاہب کی سیرتوں کا پیغام کیوں نہیں؟ اس سوال پر آغاز ہی میں بحث کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا ذہن اس بات پر پوری طرح مطمئن ہو جائے کہ درحقیقت قدیم اور جدید زمانوں کے کسی رہنما کی سیرت میں نہیں بلکہ ایک نبی کی سیرت ہی میں ہدایت پا سکتے ہیں، اور کسی دوسرے نبی یا پیشوائے مذہب کی زندگی میں نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں ہم کو صحیح اور مکمل ہدایت مل سکتی ہے جس کے ہم فی الواقع محتاج ہیں۔

**خدائی ہدایت کی ضرورت** یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ علم کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے اس کائنات کو بنایا ہے اور اس میں انسان کو پیدا کیا ہے۔ اُس کے سوا کائنات کی حقیقتوں کا اور خود انسانی فطرت اور اس کی حقیقت کا علم اور کس کو ہو سکتا ہے؟ خالق ہی تو اپنی مخلوق کو جان سکتا ہے۔ مخلوق اگر کچھ جانے گا تو خالق کے بتانے ہی سے جانے گا۔ اُس کے پاس خود اپنا کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے وہ حقیقت جان سکے۔

اس معاملے میں دو قسم کی چیزوں کا فرق اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے تاکہ خلطِ مبحث نہ ہونے پائے۔

ایک قسم کی چیزیں وہ ہیں جنہیں آپ اپنے حواس سے محسوس کر سکتے ہیں اور ان کے ذریعہ سے حاصل ہونے والی معلومات کو فکر و استدلال اور مشاہدات و تجربات کی مدد سے مرتب کر کے نئے نئے نتائج تک پہنچ سکتے

ں نوعیت کی چیزوں کے بارے میں عالمِ بالا سے کوئی تعلیم آنے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ کی اپنی تلاش وجستجو، غور وفکر
ر تحقیق اکتشاف کا دائرہ ہے۔ اسے آپ پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے گردوپیش کی دنیا میں پائی جانے والی اشیاء
ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں، ان میں کام کرنے والی قوتوں کو معلوم کریں، ان کے اندر کارفرما قوانین کو سمجھیں، اور
قی کی راہ میں آگے بڑھتے چلے جائیں۔ اگرچہ اس معاملہ میں بھی آپ کے خالق نے آپ کا ساتھ چھوڑ نہیں دیا ہے۔
تاریخ کے دوران میں بالکل غیر محسوس طریقے سے ایک تدریج کے ساتھ اپنی پیدا کی ہوئی دنیا سے آپ کا تعارف
را تا رہا ہے، واقفیت کے نئے نئے دروازے آپ پر کھولتا رہا ہے، اور وقتاً فوقتاً ایک الہامی طریقے سے
ہی نہ کسی انسان کو ایسی بات سُجھاتا رہا ہے جس سے وہ کوئی نئی چیز ایجاد، یا کوئی نیا قانون دریافت کر سکا۔
بہرحال یہ ہے انسانی علم ہی کا دائرہ جس کے لیے کسی نبی اور کسی کتاب کی حاجت نہیں ہے، اور اس دائرے میں جو
لومات مطلوب ہیں انہیں حاصل کرنے کے ذرائع انسان کو دے دیے گئے ہیں۔

دوسری قسم کی چیزیں وہ ہیں جو ہمارے حواس کی پہنچ سے بالاتر ہیں، جن کا ادراک ہم کسی طرح نہیں کر سکتے۔
ہیں نہ ہم تول سکتے ہیں، نہ ناپ سکتے ہیں، نہ اپنے علم کے ذرائع میں سے کوئی ذریعہ استعمال کر کے اُن کو معلوم
سکتے ہیں۔ فلسفی اور سائنسدان ان کے متعلق اگر کوئی رائے قائم کرتے ہیں تو وہ محض قیاس پر مبنی ہوتی ہے جسے
لم نہیں کہا جا سکتا۔ یہ آخری حقیقتیں (ULTIMATE REALITIES) ہیں جن کے بارے میں استدلالی
ظریات کو خود وہ لوگ بھی یقینی قرار نہیں دے سکتے جنہوں نے اُن نظریات کو پیش کیا ہے۔ اور اگر وہ اپنے
لم کے حدود کو جانتے ہوں تو ان پر نہ خود ایمان لا سکتے ہیں نہ کسی کو ایمان لانے کی دعوت دے سکتے ہیں۔

**بیاء کی پیروی کی ضرورت** اس دائرے میں علم اگر پہنچتا ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے پہنچتا ہے کیونکہ
ی حقائق کا جاننے والا ہے۔ اور جس ذریعہ سے اللہ تعالیٰ انسان کو یہ علم دیتا ہے وہ وحی ہے جو صرف
بیاء پر نازل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آج تک کبھی یہ نہیں کیا کہ ایک کتاب چھاپ کر ہر انسان کے ہاتھ میں
ے دی ہو اور اس سے کہا ہو کہ اسے پڑھ کر خود معلوم کر لے کہ تیری اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور اُس
قیقت کے لحاظ سے دنیا میں تیرا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ اس علم کو انسانوں تک پہنچانے کے لیے اُس نے
ہمیشہ انبیاء ہی کو ذریعہ بنایا ہے تاکہ وہ صرف اُس علم کی تعلیم ہی دے کر نہ رہ جائیں بلکہ اسے سمجھائیں بھی، اس
ے مطابق عمل بھی کر کے دکھائیں، اس کے خلاف چلنے والوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش بھی کریں، اور
یسے قبول کرنے والوں کو ایک ایسے معاشرے کی شکل میں منظم بھی کر دیں جس کی زندگی کا ہر شعبہ اُس علم کا

عملی مظہر ہو۔

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہم رہنمائی کے لیے صرف ایک نبی کی سیرت ہی کے محتاج ہیں۔ کوئی غیر نبی اگر نبی کا پیرو نہ ہو تو خواہ وہ کیسا ہی مُتبحّرِ عالم اور دانا و فرزانہ ہو، ہمارا رہنما نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس کے پاس حقیقت کا علم نہیں ہے، اور جسے حقیقت کا علم نہ ہو وہ ہمیں کوئی صحیح و برحق نظامِ حیات نہیں دے سکتا۔

**محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسرے انبیاء سے ہدایت نہ ملنے کی وجہ**

اب اس سوال کو لیجیے کہ جن بزرگوں کو ہم انبیاء کی حیثیت سے جانتے ہیں، اور جن پیشوایانِ مذاہب کے بارے میں گمان کیا جاسکتا ہے کہ شاید وہ نبی ہوں، ان میں سے ہم صرف ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت سے کیوں پیغام حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں؟ کیا یہ کسی قسم کے تعصب کی وجہ سے ہے یا اس کی کوئی معقول وجہ ہے؟

میں عرض کرتا ہوں کہ اس کی ایک نہایت معقول وجہ ہے۔ جن انبیاء کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے ان کو اگرچہ ہم یقینی طور پر نبی مانتے اور جانتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کی تعلیم اور سیرت بھی ہم تک کسی قابلِ اعتماد اور مستند ذریعہ سے نہیں پہنچی ہے کہ ہم اُس کی پیروی کرسکیں۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام بلاشبہ نبی تھے، اور ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ مگر ان پر نازل کئے والی کوئی کتاب آج محفوظ شکل میں موجود نہیں ہے کہ اس سے ہم ہدایت حاصل کرسکیں اور ان میں سے کسی کی زندگی کے حالات بھی ایسے محفوظ اور مُعتبر طریقے سے ہم تک نہیں پہنچے ہیں کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کو اپنا رہنما بنا سکیں۔ اگر ان سارے انبیاء کی تعلیمات اور سیرت پہ کوئی شخص کچھ لکھنا چاہے تو چند صفحات سے زیادہ نہیں لکھ سکتا اور وہ بھی صرف قرآن کی مدد سے۔ کیونکہ قرآن مجید کے سوا اُن کے بارے میں کوئی مُستند مواد موجود نہیں ہے۔

**دینِ یہود کی کتابوں اور انبیاء کا حال**

حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد آنے والے انبیاء کے حالات اور ان کی تعلیمات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بائبل کے عہدِ عتیق (OLD TESTAMENT) میں ہیں۔ لیکن تاریخی اعتبار سے ذرا بائبل کا جائزہ لے کر دیکھیے۔ اصل تورات جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی، چھٹی صدی قبلِ مسیح میں بیت المقدس کی تباہی کے وقت ضائع ہوچکی تھی اور اسی کے ساتھ دوسرے اُن انبیاء کے صحیفے بھی ضائع ہوگئے تھے جو اُس زمانے سے پہلے ہوگذرے تھے۔ پانچویں صدی قبلِ مسیح میں جب بنی اسرائیل بابل کی اسیری

سے رہا ہو کر فلسطین پہنچے تو حضرت عُزَیر (EZRA) نے چند دوسرے بزرگوں کی مدد سے حضرت موسیٰ کی سیرت اور بنی اسرائیل کی تاریخ مرتب کی اور اسی میں تورات کی وہ آیات بھی حسبِ موقع درج کر دیں جو انہیں اور اُن کے مددگاروں کو دستیاب ہو سکیں۔ اس کے بعد چوتھی صدی قبلِ مسیح سے لے کر دوسری صدی قبلِ مسیح تک مختلف لوگوں نے (جو نہ معلوم کون تھے) اُن انبیاء کے صحیفے (نہ معلوم کن ذرائع سے) تصنیف کر لیے جو اُن سے کئی صدی قبل گزر چکے تھے۔ مثلاً ۳۰۰ قبلِ مسیح میں حضرت یونسؑ کے نام سے ایک کتاب کسی شخص نے لکھ کر بائبل میں درج کر دی، حالانکہ وہ آٹھویں صدی قبلِ مسیح کے نبی تھے۔ زَبُور (PSALMS) حضرت داؤدؑ کی وفات کے پانچ سو برس بعد لکھی گئی اور اُس میں حضرت داؤدؑ کے علاوہ تقریباً ایک سو دوسرے شاعروں کی نظمیں بھی شامل کر دی گئیں جو معلوم نہیں کن ذرائع سے زَبور مرتب کرنے والوں کو پہنچی تھیں۔ حضرت سلیمان کی وفات ۹۳۳ قبلِ مسیح میں ہوئی اور امثالِ سلیمان (PROVERBS) ۲۵۰ قبلِ مسیح میں لکھی گئی اور اس میں دوسرے بہت سے حکماء کے اقوال بھی شامل کر دیے گئے۔

غرض، بائبل کی کسی کتاب کی سند بھی اُن انبیاء تک نہیں پہنچتی جن کی طرف وہ منسوب ہے۔ اس پر مزید یہ کہ عبرانی بائبل کی یہ کتابیں بھی ۷۰ء میں بیت المقدس کی دوسری تباہی کے وقت ضائع ہو گئیں اور ان کا صرف یونانی ترجمہ باقی رہ گیا جو ۲۵۰ قبلِ مسیح سے پہلی صدی قبلِ مسیح تک کیا گیا تھا۔ عبرانی بائبل کو دوسری صدی عیسوی میں یہودی علماء نے اُن مسوّدات کی مدد سے مرتب کیا جو بچے رہ گئے تھے۔ اُس کا قدیم ترین نسخہ جو اب پایا جاتا ہے ۹۱۶ء کا لکھا ہوا ہے۔ اُس کے سوا اور کوئی عبرانی نسخہ اب موجود نہیں ہے۔ بحیرۂ مُردار (DEAD SEA) کے قریب غارِ قُمران میں جو عبرانی طُومارے (SCROLLS) ملے ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ دوسری اور پہلی صدی قبلِ مسیح کے لکھے ہوئے ہیں اور ان میں بائبل کے صرف چند منتشر اجزا ہی پائے جاتے ہیں۔ بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کا جو مجموعہ سامریوں (SAMARITANS) کے ہاں رائج ہے اس کا قدیم ترین نسخہ گیارھویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے۔ یونانی ترجمہ جو تیسری اور دوسری صدی قبلِ مسیح میں کیا گیا تھا وہ بے شمار غلطیوں سے لبریز تھا، اور اُس ترجمے سے لاطینی زبان کا ترجمہ دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں ہوا۔ حضرت موسیٰؑ اور بعد کے انبیاء بنی اسرائیل کے حالات اور تعلیمات کے بارے میں اس مواد کو آخر کس معیار کے لحاظ سے مستند (AUTHENTIC) کہا جا سکتا ہے؟

اس کے علاوہ یہودیوں میں کچھ سینہ بسینہ روایات بھی پائی جاتی تھیں جنہیں زبانی قانون (ORAL LAW)

کہا جاتا تھا۔ یہ تیرہ چودہ سو برس تک غیر مکتوب رہیں۔ دوسری صدی عیسوی کے آخر اور تیسری صدی کے آغاز میں کربی یہودا بن شمعون نے ان کو مشناہ (MISHNAH) کے نام سے تحریری شکل دی۔ فلسطینی علمائے یہود نے اس کی شرحیں حلقہ (HALAKAH) کے نام سے اور بابلی علماء نے (HAGGADAH) کے نام سے تیسری اور پانچویں صدی میں لکھیں، اور انہی تین کتابوں کا مجموعہ تَلمُود کہلاتا ہے۔ ان کی کسی روایت کی کوئی سند نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ کن لوگوں سے کن لوگوں تک پہنچیں۔

**حضرت عیسیٰؑ اور دینِ نصاریٰ کی کتابوں کا حال**

کچھ ایسا ہی حال حضرت عیسیٰ کی سیرت اور تعلیمات کا ہے۔ اصل انجیل جو خدا کی طرف سے وحی کے ذریعہ اُن پر نازل ہوئی تھی اُسے انھوں نے زبانی ہی لوگوں کو سُنایا اور اُن کے شاگردوں نے بھی زبانی ہی اسے دوسروں تک اِس طرح پہنچایا کہ آنجناب کے حالات اور انجیل کی آیات سب کو غلط ملط کر دیا۔ اُن میں سے کوئی چیز بھی مسیح کے زمانے میں یا اُن کے بعد لکھی نہیں گئی۔ لکھنے کا کام اُن عیسائیوں نے کیا جن کی زبان یونانی تھی، حالانکہ حضرت عیسیٰ کی زبان سریانی (SYRIAC) یا آرامی (ARAMAIC) تھی اور ان کے شاگرد بھی یہی زبان بولتے تھے۔ یونانی زبان بولنے والے بہت سے مصنفین نے ان روایات کو آرامی زبان میں سُنا اور یونانی میں لکھا۔ ان مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں میں سے کوئی بھی ۷۰ء سے پہلے کی نہیں ہے اور ان میں سے کسی نے بھی کسی واقعہ یا حضرت عیسیٰؑ کے کسی قول کی سند نہیں بیان کی جس سے معلوم ہوتا کہ انھوں نے کون سی بات کس سے سُنی تھی۔ پھر اُن کی لکھی ہوئی کتابیں بھی محفوظ نہیں رہیں۔ بائبل کے نئے عہد نامے (NEW TESTAMENT) کے ہزاروں یونانی نسخے جمع کیے گئے، مگر ان میں سے کوئی بھی چوتھی صدی عیسوی سے پہلے کا نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر گیارھویں سے چودھویں صدی تک کے ہیں۔ مصر میں پاپیرس پر لکھے ہوئے جو منتشر اجزا ملے ہیں ان میں سے بھی کوئی تیسری صدی سے قدیم تر نہیں ہے۔ یونانی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کس نے کب اور کہاں کیا؟ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ چوتھی صدی میں پوپ کے حکم سے اس پر نظر ثانی کا کام کیا گیا، اور پھر سولھویں صدی میں اسے چھوڑ کر یونانی سے لاطینی میں ایک نیا ترجمہ کر دیا گیا۔ یونانی سے سُریانی زبان میں چاروں انجیلوں کا ترجمہ غالباً ۲۰۰ء میں ہوا تھا، مگر اس کا بھی قدیم ترین نسخہ جو پایا جاتا ہے چوتھی صدی کا لکھا ہوا ہے، اور پانچویں صدی کا جو قلمی نسخہ ملا ہے وہ اُس سے کافی مختلف ہے۔ سریانی سے جو عربی ترجمے کیے گئے ان میں سے بھی کوئی ترجمہ آٹھویں صدی سے پہلے کا نہیں ہے۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ ستّر کے قریب انجیلیں لکھی گئی تھیں مگر ان میں سے صرف چار کو پیشوایانِ دینِ مسیح نے قبول کیا اور باقی سب کو رد کر دیا۔ کچھ نہیں معلوم کہ قبول

کیا تو کیوں اور رد کیا تو کیوں؟ اس مواد کی بنا پر حضرت عیسیٰؑ کی سیرت اور ان کی تعلیمات کو کسی درجے میں بھی مستند مانا جاسکتا ہے؟

**زردشتی مذہب کا حال** دوسرے پیشوایان مذاہب کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ مثلاً زَرْدُشْت (ZOROASTER) کو لیجیے جس کا صحیح زمانۂ پیدائش بھی اب ٹھیک معلوم نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ سکندر کی فتح ایران سے ڈھائی سو سال پہلے اس کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ یعنی مسیح سے ساڑھے پانچ سو سال قبل۔ اس کی کتاب اَوِسْتا اپنی اصل زبان میں اب ناپید ہے اور وہ زبان بھی مُردہ ہو چکی ہے جس میں وہ لکھی یا زبانی بیان کی گئی تھی۔ نویں صدی عیسوی میں اس کے بعض اجزاء کا ترجمہ ۹ جلدوں میں تشریح کے ساتھ کیا گیا تھا، مگر اس کی دو پہلی جلدیں ضائع ہوگئیں، اور اب اس کا جو قدیم ترین نسخہ پایا جاتا ہے وہ تیرھویں صدی کے وسط کا لکھا ہوا ہے۔ یہ تو ہے زردشت کی پیش کردہ کتاب کا حال۔ رہا خود اس کی سیرت کا معاملہ، تو اس کے متعلق ہماری معلومات اس سے زیادہ کچھ نہیں ہیں کہ ۴۰ سال کی عمر میں اس نے تبلیغ شروع کی۔ دو سال بعد بادشاہ گُشْتاسُپ نے اس کی پیروی اختیار کر لی اور اس کا مذہب سرکاری مذہب بن گیا۔ ۷۷ سال وہ زندہ رہا اور اس کی موت پر جتنا زمانہ گزرتا گیا اس کی زندگی عجیب وغریب افسانوں کا مجموعہ بنتی چلی گئی جن میں سے کسی کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔

**بدھ مذہب کا حال** دنیا کی مشہور ترین مذہبی شخصیتوں میں سے ایک بودھ تھا۔ زردشت کی طرح اس کے متعلق بھی یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ شاید وہ نبی ہو۔ مگر اس نے سرے سے کوئی کتاب ہی پیش ہی نہیں کی، نہ اُس کے پیروؤں نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ وہ کوئی کتاب لایا تھا۔ اس کی وفات کے سو سال بعد اس کے اقوال اور حالات کو جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا اور صدیوں تک چلتا رہا۔ مگر اس طرح کی جتنی کتابیں بدھ مذہب کی اصل کتابیں سمجھی جاتی ہیں ان میں سے کسی کے اندر بھی کوئی سند درج نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ کس ذریعہ سے ان احوال و اقوال اور تعلیمات کے درج کرنے والوں کو بدھ کے حالات اور اس کے اقوال پہنچے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہم دوسرے انبیاء اور مذہبی پیشواؤں کی طرف رجوع کریں بھی تو اُن کے بارے میں کوئی مُستَنَد ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے ہم ان کی تعلیمات اور ان کی زندگیوں سے اطمینان اور یقین کے ساتھ رہنمائی حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم کسی ایسے نبی کی طرف رجوع کریں جس نے کوئی قابلِ اعتماد اور تحریف و آمیزش سے پاک کتاب چھوڑی ہو اور جس کے مفصل حالات و

اقوال اور اعمال معتبر ذرائع سے ہم تک پہنچے ہوں تاکہ ہم ان سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔ ایسی شخصیت پوری دنیا کی تاریخ میں صرف ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات ہے۔

قرآن کا پایۂ استناد | انہوں نے ایک کتاب (قرآن مجید) اس صریح دعوے کے ساتھ پیش کی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو مجھ پر نازل ہوا ہے۔ اس کتاب کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو یقینی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کوئی قول بھی اس میں شامل نہیں ہے، بلکہ آپ کے اقوال کو اس سے بالکل الگ رکھا گیا ہے۔ بائبل کی طرح آپ کی زندگی کے حالات اور عربوں کی تاریخ اور زمانۂ نزولِ قرآن میں پیش آنے والے واقعات کو اُس میں کلامِ الٰہی کے ساتھ خلط ملط نہیں کر دیا گیا ہے۔ یہ خالص کلام اللہ (WORD OF GOD) ہے۔ اس کے اندر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا ایک لفظ بھی شامل نہیں ہوا ہے۔ اس کے الفاظ میں سے ایک لفظ بھی کم نہیں ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے جوں کا توں یہ ہمارے زمانے تک منتقل ہوا ہے۔

یہ کتاب جس وقت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونی شروع ہوئی تھی، اسی وقت سے آپ نے اسے لکھوانا شروع کر دیا تھا۔ جب کوئی وحی آتی اُسی وقت آپ اپنے کسی کاتب کو بلاتے اور اسے لکھوا دیتے تھے۔ لکھنے کے بعد وہ آپ کو سنایا جاتا تھا اور جب آپ اطمینان کر لیتے تھے کہ کاتب نے اسے صحیح لکھا ہے تب آپ اسے ایک محفوظ جگہ رکھ دیتے تھے۔ ہر نازل شدہ وحی کے متعلق آپ کاتب کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے کس سورہ میں کس آیت سے پہلے اور کس کے بعد درج کیا جائے۔ اس طرح آپ قرآن مجید کو ترتیب بھی دیتے رہے تھے یہاں تک کہ وہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

پھر نماز کے متعلق آغازِ اسلام ہی سے یہ ہدایت تھی کہ اس میں قرآن مجید لازماً پڑھا جائے۔ اس لیے صحابۂ کرام اس کے نزول کے ساتھ ساتھ اس کو یاد کرتے جاتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اسے پورا یاد کر لیا اور ان سے بہت زیادہ بڑی تعداد ایسے اصحاب کی تھی جنہوں نے کم و بیش اس کے مختلف حصے اپنے حافظے میں محفوظ کر لیے تھے۔ ان کے علاوہ وہ متعدد صحابہ جو پڑھے لکھے تھے قرآن مجید کے مختلف حصوں کو بطورِ خود لکھ بھی رہے تھے۔ اِس طرح قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہی میں چار طریقوں سے محفوظ ہو چکا تھا:

۱۔ آپؐ نے خود کاتبینِ وحی سے اس کو اوّل تا آخر لکھوا لیا۔

۲۔ بہت سے صحابہؓ نے پورا کا پورا قرآن لفظ بلفظ یاد کر لیا۔

۳۔ صحابۂ کرام میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے قرآن مجید کا کوئی نہ کوئی حصہ، تھوڑا یا بہت یاد نہ کر لیا ہو، کیونکہ اُسے نماز میں پڑھنا ضروری تھا۔ اور صحابہ کی تعداد کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آخری حج میں ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہ شریک تھے۔

۴۔ پڑھے لکھے صحابہ کی ایک اچھی خاصی تعداد نے اپنے طور پر قرآن مجید کو لکھ لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنا کر اُس کی صحت کا اطمینان بھی کر لیا تھا۔

پس یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ آج جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے یہ لفظ بلفظ وہی ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اللہ کی حیثیت سے پیش فرمایا تھا۔ حضورؐ کی وفات کے بعد آپ کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تمام حافظوں اور تحریری نوشتوں کو جمع کر کے اس کا ایک مکمل نسخہ کتابی صورت میں لکھوا لیا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اُسی کی نقلیں سرکاری طور پر دنیائے اسلام کے مرکزی مقامات کو بھیجی گئیں۔ ان میں سے دو نقلیں آج بھی دنیا میں موجود ہیں، ایک استنبول میں اور دوسری تاشقند میں۔ جس کا جی چاہے قرآن مجید کا کوئی مطبوعہ نسخہ لیجا کر اُن سے ملالے۔ کوئی فرق وہ نہ پائے گا۔ اور فرق ہو کیسے سکتا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک ہر پُشت (GENERATION) میں لاکھوں اور کروڑوں حافظ موجود رہے ہیں۔ ایک لفظ بھی اگر کوئی شخص بدلے تو یہ حفاظ اس کی غلطی پکڑ لیں گے۔ پچھلی صدی کے آخر میں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی کے ایک انسٹی ٹیوٹ نے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے ہر زمانے کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے قلمی اور مطبوعہ ۴۲ ہزار نسخے جمع کیے تھے۔ پچاس سال تک ان پر تحقیقی کام کیا گیا۔ آخر میں جو رپورٹ پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ ان نسخوں میں کتابت کی غلطیوں کے سوا کوئی فرق نہیں ہے، حالانکہ یہ پہلی صدی ہجری سے چودھویں صدی تک کے نسخے تھے اور دنیا کے ہر حصے سے فراہم کیے گئے تھے۔ افسوس ہے کہ دوسری جنگِ عظیم میں جب جرمنی پر بمباری کی گئی تو وہ انسٹی ٹیوٹ تباہ ہو گیا لیکن اس کی تحقیقات کے نتائج دنیا سے ناپید نہیں ہوئے۔

ایک اور بات قرآن مجید کے متعلق یہ بھی نگاہ میں رکھیے کہ جس زبان میں یہ نازل ہوا تھا وہ ایک زندہ زبان ہے۔ عراق سے مراکو تک تقریباً ۱۲ کروڑ انسان آج بھی اسے مادری زبان کی حیثیت سے بولتے ہیں، اور غیر عرب دنیا میں بھی لاکھوں آدمی اسے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ عربی زبان کی گرامر، اس کی لُغت، اس کے الفاظ

کے تلفظ اور اس کے محاورے ۱۴ سو برس سے جوں کے توں رائج ہیں - آج ہر عربی دان اسے پڑھ کر اسی طرح سمجھ سکتا ہے جس طرح ۱۴ سو برس پہلے کے عرب سمجھتے تھے۔

یہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم خصوصیت جو ان کے سوا کسی نبی اور کسی پیشوائے مذہب کو حاصل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے جو کتاب اُن پر نازل ہوئی تھی وہ اپنی اصل زبان میں اپنے اصل الفاظ کے ساتھ بلا تغیر و تبدل موجود ہے۔

**سیرت وسنتِ رسولؐ کا پایۂ استناد**

اب دوسری خصوصیت کو دیکھیے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء اور پیشوایانِ مذاہب میں منفرد ہیں۔ آپ کی لائی ہوئی کتاب کی طرح آپ کی سیرت بھی محفوظ ہے جس سے ہم زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ بچپن سے لے کر آخری سانس تک جتنے لوگوں نے آپ کو دیکھا آپ کے حالاتِ زندگی دیکھے، آپ کے اقوال سُنے، آپ کی تقریریں سُنیں، آپ کو کسی چیز کا حکم دیتے سُنا یا کسی چیز سے منع کرتے سُنا، ان کی ایک عظیم تعداد نے سب کچھ یاد رکھا اور بعد کی نسل تک اُسے پہنچایا۔ بعض محققین کے نزدیک ایسے لوگوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچتی ہے جنہوں نے آنکھوں دیکھے اور کانوں سُنے ہوئے واقعات بعد کی نسل تک منتقل کیے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض احکام خود لکھوا کر بھی بعض لوگوں کو دیے یا بھیجے تھے جو بعد کے لوگوں کو ملے۔ صحابہ میں سے کم از کم چھ اصحاب ایسے تھے جنہوں نے آپ کی احادیث لکھ کر آپ کو سُنا دی تھیں تاکہ ان میں کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ یہ تحریریں بھی بعد آنے والوں کو ملیں۔ حضورؐ کی وفات کے بعد کم از کم پچاس صحابہ نے آپ کے حالات، واقعات اور اقوال تحریری صورت میں جمع کیے اور یہ ذخیرۂ علم بھی ان لوگوں تک پہنچا جنہوں نے بعد میں احادیث کو جمع اور مرتب کرنے کی خدمت انجام دی۔ پھر جن صحابہؓ نے سیرت کی معلومات زبانی روایت کیں ان کی تعداد، جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، بعض محققین کے نزدیک ایک لاکھ تک پہنچتی ہے۔ اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کیونکہ آخری حج جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمایا، جسے حَجَّۃُ الوَداع کہا جاتا ہے اس میں ایک لاکھ چالیس ہزار آدمی موجود تھے۔ اتنے آدمیوں نے آپ کو حج کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ سے حج کا طریقہ سیکھا۔ وہ تقریریں سُنیں جو حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے کیں۔ کیسے ممکن ہے کہ اتنے لوگ جب ایسے موقع پر آپ کے ساتھ حج میں شریک ہونے کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں واپس پہنچے ہوں گے تو وہاں ان کے عزیزوں، دوستوں اور ہم وطنوں نے ان سے اس سفر کے حالات نہ پوچھے ہوں اور حج کے احکام دریافت نہ کیے ہوں۔ اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

جیسی عظیم شخصیت کے اِس دنیا سے گزر جانے کے بعد لوگ کس اشتیاق کے ساتھ آپ کے احوال و اقوال اور احکام و ہدایات اُن لوگوں سے پوچھتے ہوں گے جنہوں نے آپ کو دیکھا تھا اور آپ کے ارشادات سُنے تھے۔

صحابہ کرام سے جو روایات بعد کی نسلوں کو پہنچی تھیں ان کے بارے میں ابتدا ہی سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ جو شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہتا اس کو یہ بتانا پڑتا تھا کہ اس نے وہ بات کس سے سُنی ہے اور اوپر سلسلہ بہ سلسلہ کون کس سے یہ بات سُنتا اور آگے بیان کرتا رہا ہے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک روایت کی پوری کڑیاں دیکھی جاتی تھیں تاکہ یہ اطمینان کر لیا جائے کہ وہ صحیح طور پر حضورؐ سے منقول ہوئی ہے۔ اگر روایت کی پوری کڑیاں نہ ملتی تھیں تو اس کی صحت مشتبہ ہو جاتی تھی۔ اگر کڑیاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتیں لیکن بیچ میں کوئی راوی ناقابلِ اعتماد ہوتا تو ایسی روایت بھی قبول نہ کی جاتی تھی۔ آپ ذرا غور کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ دنیا کے کسی دوسرے انسان کے حالات اس طرح سے مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ یہ خصوصیت صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ کے بارے میں کوئی بات بھی سند کے بغیر تسلیم نہیں کی گئی۔ اور سند میں بھی صرف یہی نہیں دیکھا گیا کہ ایک حدیث کا سلسلہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے یا نہیں، بلکہ یہ بھی دیکھا گیا کہ اس سلسلے کے تمام راوی بھروسے کے قابل ہیں یا نہیں۔ اس غرض کے لیے راویوں کے حالات کی بھی جانچ پڑتال کی گئی اور اس پر مفصل کتابیں لکھ دی گئیں جن سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون قابلِ اعتماد تھا اور کون نہ تھا۔ کس کی سیرت و کردار کا کیا حال تھا۔ کس کا حافظہ ٹھیک تھا اور کس کا ٹھیک نہ تھا۔ کون اُس شخص سے ملا تھا جس سے اس نے روایت نقل کی ہے اور کون اُس سے ملاقات کے بغیر ہی اُس کا نام لے کر روایت بیان کر رہا ہے۔ اس طرح اتنے بڑے پیمانے پر راویوں کے متعلق معلومات جمع کی گئی ہیں کہ آج بھی ہم ایک ایک حدیث کے متعلق یہ جانچ سکتے ہیں کہ وہ قابلِ اعتماد ذرائع سے آئی ہے یا ناقابلِ اعتماد ذرائع سے۔ کیا انسانی تاریخ میں کوئی دوسرا شخص ایسا پایا جاتا ہے جس کے حالاتِ زندگی اس قدر مستند طریقے سے منقول ہوئے ہوں؟ اور کیا اس کی کوئی مثال ملتی ہے کہ ایک شخص کے حالات کی تحقیق کے لیے اُن ہزار ہا آدمیوں کے حالات پر کتابیں لکھ دی گئی ہوں جنہوں نے اس ایک شخصیت کے متعلق کوئی روایت بیان کی ہو؟

موجودہ دور کے عیسائی اور یہودی علما احادیث کی صحت مشتبہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا جو زور صرف کر رہے ہیں اُس کی اصل وجہ یہ حسد ہے کہ ان کے دین کی کتابوں اور ان کے پیشوایانِ دین کے حالات کی سرے سے کوئی سند ہی نہیں ہے۔ اسی جلن کے باعث انہوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تنقید کے معاملہ

میں علمی دیانت (INTELLECTUAL HONESTY) کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔

**حضورؐ کی زندگی کا ہر پہلو معلوم و معروف ہے**

سیرتِ رسول اکرمؐ کی صرف یہی ایک خصوصیت نہیں ہے کہ وہ ہمیں نہایت مستند ذرائع سے پہنچی ہے بلکہ اس کی یہ بھی امتیازی خصوصیت ہے کہ اس میں آپ کی زندگی کے ہر پہلو کی اتنی تفصیلات ملتی ہیں جو تاریخ کے کسی دوسرے شخص کی زندگی کے بارے میں نہیں ملتیں۔ آپ کا خاندان کیسا تھا۔ آپ کی نبوت سے پہلے کی زندگی کیسی تھی۔ آپ کو نبوت کس طرح ملی۔ آپ پر وحی کیسے نازل ہوتی تھی۔ آپ نے اسلام کی دعوت کس طریقے سے پھیلائی۔ مخالفتوں اور مزاحمتوں کا مقابلہ کس طرح کیا۔ اپنے ساتھیوں کی تربیت کیسے کی۔ اپنے گھر میں آپ کس طرح رہتے تھے۔ اپنی بیویوں اور بچوں سے آپ کا برتاؤ کیسا تھا۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں سے آپ کا معاملہ کیسا تھا۔ کس اخلاق کی تعلیم آپ دیتے تھے اور آپ کا اپنا اخلاق کیسا تھا۔ کس چیز کا آپ نے حکم دیا۔ کس کام سے آپ نے منع کیا۔ کس کام کو آپ نے ہوتے دیکھا اور منع نہ کیا اور کس چیز کو آپ نے ہوتے دیکھا اور منع فرمایا۔ یہ سب کچھ ذرا ذرا سی تفصیلات کے ساتھ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ آپ ایک فوجی جنرل بھی تھے اور آپ کی قیادت میں جتنی لڑائیاں ہوئیں ان سب کا مفصل حال ہمیں ملتا ہے۔ آپ ایک حاکم بھی تھے اور آپ کی حکومت کے تمام حالات ہمیں ملتے ہیں۔ آپ ایک جج بھی تھے اور آپ کے سامنے پیش ہونے والے مقدمات کی پوری پوری رودادیں ہمیں ملتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کس مقدمے میں آپ نے کیا فیصلہ فرمایا۔ آپ بازاروں میں بھی نکلتے تھے اور دیکھتے تھے کہ لوگ خرید و فروخت کے معاملات کس طرح کرتے ہیں۔ جس کام کو غلط ہوتے ہوئے دیکھتے اس سے منع فرماتے تھے اور جو کام صحیح ہوتے دیکھتے اس کی توثیق فرماتے تھے۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق آپ نے تفصیلی ہدایات نہ دی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کسی بے جا تعصب کے بغیر، پورے علم و یقین کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ تمام انبیاء اور پیشوایانِ مذاہب میں سے صرف ایک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہی وہ ہستی ہیں جن کی طرف نوعِ انسانی ہدایت و رہنمائی کے لیے رجوع کر سکتی ہے، کیونکہ آپ کی پیش کی ہوئی کتاب اپنے اصل الفاظ میں محفوظ ہے، اور آپ کی سیرت اُن تمام ضروری تفصیلات کے ساتھ، جو ہدایت کے لیے درکار ہیں، نہایت مُستند و مُعتبر ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آپ کی سیرتِ پاک ہمیں کیا پیغام اور کیا ہدایات دیتی ہے۔

**حضورؐ کا پیغام تمام انسانوں کے لیے ہے**

اوّلین چیز جو ہمیں آپ کی دعوت میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ رنگ و نسل

اور زبان و وطن کے سارے امتیازات کو نظر انداز کر کے انسان کو بحیثیت انسان مخاطب کرتے ہیں اور چند اصول پیش کرتے ہیں جو تمام انسانوں کی بھلائی کے لیے ہیں۔ ان اصولوں کو جو بھی مان لے وہ مسلمان ہے اور ایک عالمگیر اُمتِ مسلمہ کا فرد ہے، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، مشرق کا رہنے والا ہو یا مغرب کا، عربی ہو یا عجمی، جہاں بھی کوئی انسان ہے، جس ملک یا قوم یا نسل میں بھی وہ پیدا ہوا ہے، جو زبان بھی وہ بولتا ہے اور جو رنگ بھی اُس کی کھال کا ہے، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مخاطب ہے۔ اور اگر وہ آپ کے پیش کردہ اصولوں کو مان لیتا ہے تو بالکل مساوی حقوق کے ساتھ اُمتِ مسلمہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ کوئی چھوت چھات، کوئی اونچ نیچ، کوئی نسلی یا طبقاتی امتیاز، کوئی لسانی یا قومی یا جغرافی افتراق، جو عقیدے کی وحدت قائم ہو جانے کے بعد ایک انسان کو دوسرے انسان سے جدا کرتا ہو، اُمتِ مسلمہ میں نہیں ہے۔

**رنگ و نسل کے تعصبات کا بہترین علاج** آپ غور کریں تو محسوس کریں گے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت انسانیت کو میسر آئی ہے۔ انسان کو سب سے بڑھ کر جس چیز نے تباہ کیا وہ یہی امتیازات ہیں جو انسان اور انسان کے درمیان قائم کیے گئے ہیں۔ کہیں اُس کو نجس قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا کہ یہ اچھوت ہے، اِس کے وہ حقوق نہیں ہیں جو برہمن کے حقوق ہیں۔ کہیں اُس کو فنا کر دینے کے قابل قرار دیا گیا کیونکہ وہ آسٹریلیا اور امریکہ میں ایسے وقت پیدا ہو گیا تھا جب باہر سے آنے والوں کو اُس سے زمین خالی کرانے کی ضرورت تھی۔ کہیں اُس کو پکڑ کر غلام بنایا گیا اور اِس سے جانوروں کی طرح خدمت لی گئی کیونکہ وہ افریقہ میں پیدا ہوا تھا اور اس کا رنگ کالا تھا۔ غرض نوعِ انسانی کے لیے قوم، وطن، نسل، رنگ اور زبان کے یہ امتیازات قدیم ترین زمانے سے لے کر اِس زمانے تک بہت بڑی مصیبت کا ذریعہ بنے رہے ہیں۔ اسی بنیاد پر لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ اس بنیاد پر ایک ملک دوسرے ملک پر چڑھ دوڑا ہے۔ ایک قوم نے دوسری قوم کو لوٹا ہے۔ اور پوری پوری نسلیں تباہ و برباد کر دی گئی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرض کا ایسا علاج فرمایا کہ دشمنانِ اسلام بھی مان گئے ہیں کہ رنگ، نسل اور وطن کے امتیازات کو جس کامیابی سے اسلام نے حل کیا ہے ایسی کامیابی کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

امریکہ کے افریقی النسل باشندوں کا مشہور لیڈر میلکم ایکس، جو ایک زمانے میں گوری نسل کے خلاف کالی نسل کے شدید ترین تعصب کا علمبردار تھا، اسلام قبول کر کے جب حج کے لیے گیا اور اس نے دیکھا کہ مشرق، مغرب، شمال، جنوب، ہر طرف سے ہر نسل کے لوگ، ہر رنگ کے لوگ، ہر وطن کے لوگ، ہر زبان بولنے والے لوگ چلے آ رہے

ہیں، سب نے ایک جیسا احرام کا لباس پہن رکھا ہے، سب ایک ہی زبان میں لَبَّیک لَبَّیک کے نعرے لگا رہے ہیں، ایک ساتھ طواف کر رہے ہیں، اور ایک ہی جماعت میں ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں، تو وہ پکار اُٹھا کہ رنگ و نسل کے مسئلے کا صحیح حل یہی ہے، نہ کہ وہ جو ہم اب تک کرتے رہے ہیں۔ اُس مرحوم کو تو ظالموں نے قتل کر دیا، مگر اس کی خود نوشت سوانح عمری شائع شدہ موجود ہے۔ اُس میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ حج سے کیسا گہرا اثر اُس نے قبول کیا تھا۔

یہ حج تو اسلام کی عبادات میں سے صرف ایک عبادت ہے۔ اگر کوئی شخص آنکھیں کھول کر اسلام کی تعلیمات کو بحیثیت مجموعی دیکھے تو کسی جگہ بھی اُنگلی رکھ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ چیز کسی خاص قوم یا کسی قبیلے یا کسی نسل یا طبقے کے مفاد کے لیے ہے۔ یہ تو پورا کا پورا دین ہی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لیے ہے اور اِس کی نگاہ میں وہ سب انسان یکساں ہیں جو اس کے اصول قبول کر کے اس کی بنائی ہوئی عالمگیر برادری میں شامل ہو جائیں۔ بلکہ یہ غیر مسلموں کے ساتھ بھی وہ سلوک نہیں کرتا جو گوروں نے کالوں کے ساتھ کیا، جو سامراجی قوتوں نے اپنی محکوم قوموں کے ساتھ کیا، جو کمیونسٹ حکومتوں نے اپنے دائرۂ اقتدار میں رہنے والے غیر کمیونسٹوں کے ساتھ، حتّٰی کہ خود اپنی پارٹی کے غیر مرغوب ارکان کے ساتھ کیا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انسانیت کی فلاح کے لیے وہ کیا اصول ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائے ہیں اور ان میں کیا بات ایسی ہے جو نہ صرف فلاحِ انسانیت کی ضامن ہے بلکہ تمام انسانوں کو ایک وحدت کی لڑی میں پرو کر ایک اُمت بھی بنا سکتی ہے۔

**اللہ کی وحدانیت کا وسیع ترین تصوّر**

ان میں سب سے مقدم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنا ہے۔ صرف اس معنی میں نہیں کہ اللہ ہے، اور محض اس معنی میں بھی نہیں کہ اللہ بس ایک ہے۔ بلکہ اس معنی میں کہ اِس کائنات کا واحد خالق، مالک، مُدبّر اور حاکم اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ کوئی دوسری ہستی پوری کائنات میں ایسی نہیں ہے جس کے پاس حاکمیت کا اقتدار ہو، جس کو حکم دینے اور منع کرنے کا حق ہو، جس کے حرام کرنے سے کوئی چیز حرام اور جس کے حلال کرنے سے کوئی چیز حلال ہو سکتی ہو۔ یہ اختیارات اُس کے سوا کوئی نہیں رکھتا، کیونکہ وہ خالق اور مالک ہے، اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنے بندوں کو اپنی پیدا کردہ دنیا میں جس چیز کی چاہے اجازت دے اور جس سے چاہے منع کر دے۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ اللہ کو اس حیثیت سے مانو۔ اُس کو اس حیثیت سے مانو کہ ہم اس کے سوا کسی کے بندے نہیں ہیں اور اُس کے قانون کے خلاف کسی کو ہم پر حکم چلانے کا حق نہیں ہے۔ اِس حیثیت سے مانو کہ

ہمارا سر اُس کے سوا کسی کے سامنے جھکنے کے لیے نہیں بنا ہے۔ اِس حیثیت سے مانو کہ ہماری تقدیر بنانے اور بگاڑنے والا صرف وہی ہے۔ اِس حیثیت سے مانو کہ ہمارا جینا اور مرنا بالکل اُس کے اختیار میں ہے۔ جس وقت چاہے ہمیں موت دے سکتا ہے اور جس وقت تک چاہے زندہ رکھ سکتا ہے۔ اس کی طرف سے موت آئے تو دنیا کی کوئی طاقت بچا لینے والی نہیں اور وہ زندگی عطا کرے تو دنیا کی کوئی طاقت ہلاک کر دینے والی نہیں۔ یہ ہے اسلام کا تصورِ خدا۔

اِس تصور کے مطابق زمین سے لے کر آسمانوں تک ساری کائنات خدا کی تابع فرمان ہے اور انسان جو اِس کائنات میں رہتا ہے، اُس کا بھی یہی کام ہے کہ خدا ہی کا تابع فرمان بن کر رہے۔ اگر وہ خود مختار بنے یا خدا کے سوا کسی اور کی اطاعت اختیار کرے تو اُس کی زندگی کا نظام پورے نظامِ کائنات کے خلاف ہو جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھیے کہ ساری کائنات خدا کے حکم کے تحت چل رہی ہے۔ یہ ایک امرِ واقعی ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ اب اگر ہم خدا کے سوا کسی اور کے حکم کے تحت چل رہے ہوں، یا اپنی مرضی کے مختار بن کر جدھر جی چاہے چل رہے ہوں، تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہماری زندگی کی گاڑی پوری کائنات کی گاڑی کے خلاف سمت میں چل رہی ہے۔ ایک مستقل تصادم ہے جو ہمارے اور نظامِ کائنات کے درمیان ہو رہا ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ اِس تصور کے مطابق انسان کے لیے صحیح طریقِ حیات (WAY OF LIFE) صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے، کیونکہ وہ مخلوق ہے اور اللہ اس کا خالق ہے۔ مخلوق ہونے کی حیثیت سے اس کا خود مختار بن جانا بھی غلط ہے، اور اپنے خالق کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا بھی غلط۔ اِن دونوں راستوں میں سے جو راستہ بھی وہ اختیار کرے گا وہ حقیقت سے متصادم ہوگا، اور حقیقت سے ٹکرانے کا نقصان خود ٹکرانے والے ہی کو پہنچتا ہے۔ حقیقت کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔

**بندگیٔ رب کی دعوت** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت یہ ہے کہ اِس تصادُم کو ختم کرو۔ تمہاری زندگی کا قانون اور ضابطہ بھی وہی ہونا چاہیے جو پوری کائنات کا ہے۔ تمہارا حاکم بھی وہی ہونا چاہیے جو ساری کائنات کا ہے۔ تم نہ خود قانون ساز بنو اور نہ کسی دوسرے کا یہ حق تسلیم کرو کہ وہ خدا کی زمین میں خدا کے بندوں پر اپنا قانون چلائے۔ قانونِ برحق صرف خداوندِ عالَم کا قانون ہے، باقی سب قوانین باطل ہیں۔

**اطاعتِ رسولؐ کی دعوت** یہاں پہنچ کر ہمارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا دوسرا نکتہ آتا

ہے، اور وہ آپ کا یہ دوٹوک بیان ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا نبی ہوں، اور نوعِ انسانی کے لیے اُس نے اپنا قانون میرے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ میں خود بھی اِس قانون کا پابند ہوں۔ خود مجھے بھی اس میں تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ میں اِتباع کرنے پر مامور ہوں، اپنی طرف سے کوئی نئی چیز اِختراع کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ یہ قرآن مجید وہ قانون ہے جو مجھ پر خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اور میری سنّت وہ قانون ہے جو خدا کے حکم و ارشاد کی بنا پر میں جاری کرتا ہوں۔ اِس قانون کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے والا سب سے پہلے میں ہوں (اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ)۔ اِس کے بعد تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہوں کہ ہر دوسرے قانون کی پیروی چھوڑ کر اس قانون کی پیروی کریں۔

**اللہ کے بعد اطاعت کا مستحق اللہ کا رسول ہے**

کسی کو یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی سنّت کی اطاعت و پیروی کیسے کر سکتے تھے جبکہ وہ آپ کا اپنا ہی قول یا فعل ہوتا تھا؟ اِس معاملے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ قرآن جس طرح خدا کی طرف سے تھا اُسی طرح رسول ہونے کی حیثیت سے جو حکم آپ دیتے، یا جس کام سے آپ منع فرماتے، یا جس طریقے کو آپ مقرر کرتے تھے، وہ بھی اللہ ہی کی طرف سے ہوتا تھا۔ اُسی کا نام سُنّتِ رسول ہے، اور اس کی پیروی آپؐ خود بھی اُسی طرح کرتے تھے جس طرح سب اہلِ ایمان کے لیے اُس کی پیروی لازم تھی۔ یہ بات ایسے مواقع پر پوری طرح واضح ہو جاتی تھی جب صحابۂ کرام کسی معاملے میں آپؐ سے پوچھتے تھے کہ یا رسول اللہؐ، کیا آپ یہ اللہ کے حکم سے فرما رہے ہیں یا یہ آپ کی اپنی رائے ہے؟ اور آپ جواب دیتے تھے کہ اللہ کا حکم نہیں ہے بلکہ میری رائے ہے۔ ایسے مواقع پر صحابہ حضورؐ کی رائے سے اختلاف کر کے اپنی تجویز پیش کرتے تھے اور آپ اپنی رائے چھوڑ کر اُن کی تجویز قبول فرما لیتے تھے۔ اِسی طرح یہ بات اُن مواقع پر بھی کھل جاتی تھی جب آپ کسی معاملے میں صحابہ سے مشورہ طلب فرماتے تھے۔ یہ مُشاورت خود اِس امر کی دلیل ہوتی تھی کہ اِس معاملے میں خدا کی طرف سے کوئی حکم نہیں آیا ہے، کیونکہ خدا کا حکم ہوتا تو اس میں مشاورت کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ ایسے مواقع رسولِ اکرم علیہ الصّلوٰۃُ والسّلام کے عہد میں بارہا پیش آئے ہیں جن کی تفصیلات احادیث میں ہم کو ملتی ہیں۔ بلکہ صحابہ کرام کا تو یہ بیان ہے کہ ہم نے حضورؐ سے زیادہ مشاورت کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ اس پر آپ غور کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ بھی حضورؐ کی سنّت ہی تھی کہ جس معاملہ میں اللہ کا حکم نہ ہو اس میں مشورہ کیا جائے اور کوئی دوسرا حاکم تو درکنار، اللہ کا رسول تک اپنی ذاتی رائے کو لوگوں کے لیے فرمانِ واجبُ الاِذعان نہ قرار دے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو شوریٰ کے طریقے سے کام کرنے کی تربیت دی، اور لوگوں

کو یہ سکھایا کہ جس معاملہ میں حکمِ الٰہی ہو اُس میں بے چون وچرا اطاعت کرو، اور جہاں حکمِ الٰہی نہ ہو وہاں آزادیِ اظہارِ رائے کا حق بے خوف وخطر استعمال کرو۔

**آزادی کا حقیقی چارٹر** یہ نوعِ انسانی کے لیے آزادی کا وہ چارٹر ہے جو دینِ حق کے سوا دنیا میں کسی نے اُس کو نہیں دیا۔ اللہ کے بندے صرف ایک اللہ ہی کے بندے ہوں اور کسی کے بندے نہ ہوں، حتّٰی کہ اللہ کے رسول کے بندے بھی نہ ہوں۔ اِس نے انسان کو ایک خدا کے سوا ہر دوسرے کی بندگی سے آزاد کر دیا اور انسان پر سے انسان کی خدائی ہمیشہ کے لیے ختم کر دی۔ اِس کے ساتھ ایک عظیم ترین نعمت جو اس پیغام نے انسان کو عطا کی وہ ایک ایسے قانون کی بالاتری ہے جسے توڑنے مروڑنے اور ردّ و بدل کا تختۂ مشق بنانے کا اختیار کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر یا جمہوری مجلس قانون ساز یا اسلام قبول کرنے والی کسی قوم کو حاصل نہیں ہے۔ یہ قانون خیر وشر کی مستقل قدریں (PERMANENT VALUES) انسان کو دیتا ہے جنہیں بدل کر کبھی کوئی خیر کو شر اور شر کو خیر نہیں بنا سکتا۔

**آخرت کا عقیدہ** تیسری بات جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندگانِ خدا کو بتائی وہ یہ ہے کہ تم خدا کے سامنے جوابدہ ہو۔ تم اِس دنیا میں شترِ بے مہار بنا کر نہیں چھوڑ دیے گئے ہو کہ اپنی مرضی سے جو چاہو کرتے رہو، جس کھیت میں چاہو چرتے پھرو، اور کوئی تمہیں پوچھنے والا نہ ہو، بلکہ تم اپنے ایک ایک فعل، ایک ایک قول، اور اپنی پوری اختیاری زندگی کے اعمال کا حساب اپنے خالق ومعبود کو دینے والے ہو۔ مرنے کے بعد تمہیں اُٹھنا پڑے گا اور اپنے رب کے سامنے بازپرس کے لیے پیش ہونا پڑے گا۔

یہ ایک ایسی زبردست اخلاقی طاقت ہے جو اگر انسان کے ضمیر میں جاگزیں ہو جائے تو اُس کا حال ایسا ہو گا جیسے اُس کے ساتھ ہر وقت ایک چوکیدار لگا ہوا ہے جو بُرائی کے ہر ارادے پر اُسے ٹوکتا اور ہر اقدام پر اُسے روکتا ہے۔ باہر کوئی گرفت کرنے والی پولیس اور سزا دینے والی حکومت موجود ہو یا نہ ہو، اس کے اندر ایک محتسب ایسا بیٹھا رہے گا جس کی پکڑ کے خوف سے وہ کبھی خلوت میں، یا جنگل میں، یا اندھیرے میں، یا کسی سنسان جگہ میں بھی خدا کی نافرمانی نہ کر سکے گا۔ اِس سے بڑھ کر انسان کی اخلاقی اصلاح اور اس کے اندر ایک مستحکم کردار پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ دوسرے جتنے ذرائع سے بھی آپ اخلاق سنوارنے کی کوشش کریں گے، اِس سے آگے نہ بڑھ سکیں گے کہ بھلائی دنیا میں فائدہ مند اور بُرائی نقصان دہ ہے۔ اور یہ کہ ایمانداری ایک اچھی پالیسی ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ پالیسی کے اعتبار سے اگر بُرائی اور بے ایمانی مفید ہو اور اُس سے نقصان کا اندیشہ نہ ہو تو

اسے بلا تکلف کر ڈالا جائے۔ اسی نقطۂ نظر کا تو یہ نتیجہ ہے کہ جو لوگ اپنی انفرادی زندگی میں اچھا رویہ رکھتے ہیں، وہی اپنے قومی کردار میں انتہا درجے کے بے ایمان، دغا باز، لٹیرے اور ظالم و جابر بن جاتے ہیں۔ بلکہ انفرادی زندگی میں بھی وہ اگر بعض معاملات میں اچھے ہوتے ہیں تو بعض دوسرے معاملات میں بہت برے ہوتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک طرف وہ کاروبار میں کھرے اور برتاؤ میں خوش اخلاق ہیں تو دوسری طرف شرابی، زانی، جواری اور سخت بدکار و سیاہ کار ہیں۔ ان کا مقولہ یہ ہے کہ آدمی کی پبلک زندگی اور چیز ہے اور پرائیویٹ زندگی اور۔ نجی زندگی کے کسی عیب پر کوئی ٹوکے تو ان کا گھڑا گھڑایا جواب یہ ہوتا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو (MIND YOUR BUSINESS) اس کے بالکل برعکس آخرت کا عقیدہ ہے جو کہتا ہے کہ برائی ہر حال میں برائی ہے خواہ دنیا میں وہ مفید ہو یا نقصان دہ۔ جو شخص خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس رکھتا ہو اس کی زندگی میں پبلک اور پرائیویٹ کے دو شعبے الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ وہ ایمانداری اختیار کرتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ اچھی پالیسی ہے، بلکہ اس کے عین وجود میں ایمانداری شامل ہوتی ہے اور وہ سوچ ہی نہیں سکتا کہ اس کا کام کبھی بے ایمانی بھی ہو سکتا ہے۔ اس کا عقیدہ اسے یہ سکھاتا ہے کہ تم اگر بے ایمانی کرو گے تو جانوروں کی سطح سے بھی نیچے جا پڑو گے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۔ "ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، پھر اسے اوندھا کر سب نیچوں سے نیچ کر دیا"

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی سے انسان کو صرف ایک مستقل اخلاقی اقدار رکھنے والا ناقابلِ تبدیل قانون ہی نہیں ملا، بلکہ انفرادی اور قومی اخلاق و کردار کے لیے ایک ایسی بنیاد بھی مل گئی جو کبھی متزلزل ہونے والی نہیں ہے۔ جو اس بات کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی حکومت موجود ہو، کوئی پولیس موجود ہو، کوئی عدالت موجود ہو، تو آپ سیدھے راستے پر چلیں، ورنہ مجرم بن کر رہیں۔

### رہبانیت کے بجائے دنیا داری میں اخلاق کا استعمال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ایک اور اہم سبق ہمیں دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاق راہبوں کے گوشہ عزلت کے لیے نہیں ہے، درویشوں کی خانقاہوں کے لیے نہیں ہے، بلکہ دنیا کی زندگی کے ہر شعبے میں برتنے کے لیے ہے۔ جس روحانی اور اخلاقی بلندی کو دنیا فقیروں اور درویشوں میں تلاش کرتی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے حکومت کی مسند پر اور عدالت کی کرسی پر اٹھا لائے۔ آپ نے تجارت کے کاروبار میں خدا ترسی اور دیانت سے کام لینا سکھایا۔ آپ نے پولیس اور فوج کے

سپاہیوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کا سبق دیا۔ آپ نے انسان کی اِس غلط فہمی کو دُور کیا کہ خدا کا ولی وہ ہوتا ہے جو تارک الدنیا ہو کر بس اللہ اللہ کرتا رہے۔ آپ نے بتایا کہ ولایت اِس کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل ولایت یہ ہے کہ آدمی ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک تھانیدار، ایک تاجر و صنعت کار اور دوسری تمام ممکن حیثیتوں سے ایک پورا دنیا دار بن کر بھی ہر اُس موقع پر اپنا خدا ترس اور دیانت دار ہونا ثابت کر دے جہاں اُس کے ایمان کو آزمائش سے سابقہ پیش آئے۔ اِس طرح آپؐ اخلاق و روحانیت کو رہبانیت کے گوشوں سے نکال کر معیشت و معاشرت، سیاست و عدالت اور صلح و جنگ کے میدانوں میں لے آئے اور یہاں پاکیزہ اخلاق کی حکمرانی قائم کی۔

**حضورؐ کی ہدایت کا فیض** یہ اسی رہنمائی کا فیض تھا کہ اپنی نبوت کے آغاز میں جن لوگوں کو آپ نے ڈاکو پایا تھا ان کو اِس حالت میں چھوڑا کہ وہ امانت دار اور خلقِ خدا کی جان و مال اور آبرو کے محافظ بن چکے تھے۔ جن لوگوں کو حق مارنے والا پایا تھا انہیں حق ادا کرنے والا، حقوق کی حفاظت کرنے والا اور حقوق دلوانے والا بنا کر چھوڑا۔ آپ سے پہلے دنیا اُن حاکموں سے واقف تھی جو ظلم و جور سے رعیت کو دبا کر رکھتے تھے اور اُونچے اُونچے محلوں میں رہ کر اپنی خدائی کا سکّہ جمانے تھے۔ آپ نے اُسی دنیا کو ایسے حاکموں سے روشناس کرایا جو بازاروں میں عام انسانوں کی طرح چلتے تھے اور عدل و انصاف سے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ آپ سے پہلے دنیا اُن فوجوں سے واقف تھی جو کسی مُلک میں گھستی تھیں تو ہر طرف قتلِ عام برپا کرتی، بستیوں کو آگ لگاتی، اور مفتوح قوم کی عورتوں کو بے آبرو کرتی پھرتی تھیں۔ آپ نے اُسی دنیا کو ایسی فوجوں سے متعارف کرایا جو کسی شہر میں فاتحانہ داخل ہوتیں تو دشمن کی فوج کے سوا کسی پر دست درازی نہ کرتی تھیں اور فتح کیے ہوئے شہر سے اگر پسپا ہوتیں تو اہلِ شہر سے وصول کیے ہوئے ٹیکس تک انہیں واپس کر دیتی تھیں۔ انسانی تاریخ ملکوں اور شہروں کی فتح کے قصّوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر فتحِ مکّہ کی کوئی نظیر آپ کو تاریخ میں نہ ملے گی۔ جس شہر کے لوگوں نے تیرہ برس تک رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ظلم و ستم ڈھایا تھا اُسی شہر میں آپ کا فاتحانہ داخلہ اِس شان سے ہوا تھا کہ آپ کا سر خدا کے آگے جھکا جا رہا تھا، آپ کی پیشانی اُونٹ کے کجاوے سے لگی جا رہی تھی، اور آپ کے طرزِ عمل میں غرور و تکبر کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہی لوگ جو ۱۳ برس تک آپ پر ظلم و ستم کرتے رہے تھے، جنہوں نے آپ کو ہجرت پر مجبور کر دیا تھا اور جو ہجرت کے بعد بھی آٹھ برس تک آپ سے برسرِ جنگ رہے تھے، جب مغلوب ہو کر آپ کے سامنے پیش ہوئے تو انہوں نے آپ سے رحم و کرم کی التجا کی اور آپ

نے انتقام لینے کے بجائے فرمایا کہ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ "آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ جاؤ تم چھوڑ دیے گئے"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نمونے کا جو اثر آپ کی اُمت پر پڑا ہے اس کا اگر کوئی شخص اندازہ کرنا چاہے تو تاریخ میں خود دیکھ لے کہ مسلمان جب اسپین میں داخل ہوئے تھے تو ان کا رویہ کیا تھا، اور جب عیسائیوں نے ان پر فتح پائی تھی تو ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں جب عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور مسلمانوں نے جب بیت المقدس کو ان سے واپس لیا تو عیسائیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا تھا۔

حضرات، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ایک بحرِ ذخار ہے جس کا احاطہ کرنا کسی بڑی کتاب میں بھی ممکن نہیں ہے، کجا کہ ایک تقریر میں کیا جاسکے۔ تاہم میں نے زیادہ سے زیادہ ممکن اختصار کے ساتھ اُس کے چند نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس واحد ذریعۂ ہدایت سے رہنمائی حاصل کریں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

# رسائل و مسائل

## حضورؐ کی صاحبزادیوں کی عمریں

سوال:۔ تفہیم القرآن جلد ششم سورۃ الکوثر کے دیباچہ میں صفحہ ۴۹۰ پر ابن سعد اور ابن عساکر کے حوالہ سے آپ نے حضرت عبداللہ بن عباس کی یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے صاحبزادے حضرت قاسم تھے، ان سے چھوٹی حضرت زینبؓ تھیں، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہ تھے۔ پھر علی الترتیب تین صاحبزادیاں ام کلثومؓ، فاطمہؓ اور رقیہؓ تھیں۔ ان میں سے پہلے حضرت قاسم کا انتقال ہوا پھر حضرت عبداللہ نے وفات پائی۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا "ان کی نسل ختم ہوگئی۔ اب وہ ابتر ہیں" (یعنی ان کی جڑ کٹ گئی)۔

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت رقیہ سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ لیکن مشہور تو یہ ہے کہ حضرت فاطمہ سب سے چھوٹی تھیں۔ نیز اس روایت کے مطابق حضرت عبداللہ آلِ نبیؐ میں تیسرے نمبر پر تھے لیکن صاحب رحمۃ للعالمین نے تحریر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بعثتِ نبوت کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے حضرت ابن عباس سے منقول آلِ نبی کی ترتیب محل نظر ہے۔ براہ کرم وضاحت فرمائیں۔

حضرت قاسم بعثت نبوت سے قبل پیدا ہوئے اور قبل ہی فوت ہوگئے۔ ان کے اسم گرامی کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تحریر کرنے سے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب:۔ اس معاملہ میں بہت اختلاف ہے کہ حضور کی اولاد کی پیدائش میں زمانی ترتیب کیا ہے۔ میری تحقیق کے مطابق صاحبزادیوں میں حضرت زینب سب سے بڑی تھیں، کیونکہ ان کا نکاح زمانہ جاہلیت ہی میں ابوالعاص سے ہوگیا تھا اور روایات میں بیان ہوا ہے کہ وہ بعثت سے دس سال پہلے پیدا ہوئی تھیں۔ حضرت رُقیّہ میرے نزدیک سب سے چھوٹی نہ تھیں۔ ان کا نکاح حضرت عثمانؓ سے ہوا تھا اور وہ ان کے ساتھ ہجرت کرکے

حبشہ گئی تھیں۔ اس لیے لامحالہ ان کی عمر ۵ سنہ بعد بعثت میں کم از کم ۱۳-۱۴ سال ہونی چاہیے۔ اور حضرت فاطمہ کے متعلق روایات یہ بتاتی ہیں کہ وہ اس وقت پیدا ہوئی تھیں جب حضورؐ کی عمر ۴۱ سال تھی۔

حضورؐ کی جو اولاد بعثت سے پہلے پیدا ہوئی اور کم سنی میں وفات پاگئی اس کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

## علمی خیانت

سوال:- محمود عباسی صاحب نے تحقیق مزید کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس کے چند اقتباسات نقل کر رہا ہوں۔ براہ کرم اس امر پر روشنی ڈالیے کہ جو کچھ اس میں لکھا گیا ہے وہ کہاں تک صحیح ہے۔ الجھن یہ ہے کہ تمام سیرت نگار تو آنحضورؐ کے دادا کی وفات کے بعد ابو طالب کو حضورؐ کا سرپرست تسلیم کرتے ہیں، مگر محمود احمد عباسی کچھ اور ہی داستان بیان کر رہے ہیں۔

صفحہ ۱۲۵ = عبدالمطلب کی وفات کے وقت اُن کے نو بیٹے زندہ تھے۔ جن میں سب سے بڑے زبیر تھے، وہی قریش کے دستور کے مطابق اپنے والد کے جانشین ہوئے اور انہی کو عبدالمطلب نے اپنا وصی بھی مقرر کیا تھا۔

"والزبیر وکان شاعراً شریفاً والیہ اوصی عبدالمطلب" طبقات ابن سعد ص ۹۳ جلد ا

صفحہ ۱۲۵ = زبیر و ابو طالب اور عبداللہ والد ماجد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ تینوں ایک ماں سے حقیقی بھائی تھے۔

صفحہ ۱۲۶-۱۲۵ = قدیم ترین مؤرخ ابو جعفر محمد بن حبیب متوفی ۲۴۵ھ ہجری مولف کتاب المحبّر نے "الحکام من قریش ثم من بنی ھاشم" کے عنوان کے تحت قریش کے تمام خاندانوں میں سے جو لوگ اپنے وقت میں سردار اور حاکم رہے ان کی فہرست درج کی ہے۔ بنی ہاشم میں عبدالمطلب کے بعد زبیر بن عبدالمطلب کے بعد ان کے چھوٹے بھائی ابو طالب کے ...... نام درج کیے ہیں صفحہ ۱۳۲

صفحہ ۱۲۶ = عبدالمطلب کو اپنے اس نیک صفات اور پاکیزہ خصلت فرزند (زبیر) پر فخر و ناز ہونا بجا تھا۔ مرتے وقت انہی کو جانشین کیا۔

صفحہ ۱۲۷-۱۲۶ = حلف الفضول ...... وہ معاہدہ و حلف ہے جو قریشی خاندانوں اور قبیلوں میں ...... انہی کی تحریک پر آپس میں عبداللہ بن جدعان کے گھر بیٹھ کر کیا تھا (شرح ابن ابی الحدید)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر اپنے چچا (زبیر) کے ساتھ موجود تھے...... سن شریف اس وقت آنحضورؐ کا بروایت مختلفہ اٹھارہ سے بیس برس کا بتایا گیا ہے۔

صفحہ ۱۲۸: اپنے دادا کے انتقال کے بعد آنحضورؐ اپنے ان ہی چچا زبیر بن عبدالمطلب کی کفالت میں رہے، انہوں نے اور ان کی زوجہ عاتکہ بنت ابی وہب بن عمرو بن عائذ بن عمران بن مخزوم نے اپنے بچوں سے زیادہ محبت و شفقت سے آپ کی پرورش کی۔

صفحہ ۱۳۲: آپ اس عمر کے تھے کہ زبیر بن عبدالمطلب کی وفات کے بعد کسی دوسرے چچا اور رشتہ دار کی کفالت سے مستغنی ہو چکے تھے۔

جواب:۔ محمود عباسی صاحب کی عادت ہے کہ مشہور ترین روایات کو رد کر کے ایسی روایات تلاش کرتے ہیں جن سے مطلب برآمد ہو سکے اور اگر یہ بھی نہ ہو تو روایات کو توڑ مروڑ کر اپنے مطلب پر ڈھال لیتے ہیں۔ جس ابن سعد کی روایت انہوں نے زبیر بن عبدالمطلب کے بارے میں نقل کی ہے اسی ابن سعد نے طبقات (طبع بیروت) میں صفحہ ۱۱۹ پر یہ روایت نقل کی ہے کہ عبدالمطلب کے بعد ابو طالب نے آپؐ کی پرورش اپنے ذمے لی اور وہ اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر آپؐ سے محبت کرتے تھے۔ اس سے ایک صفحہ پہلے ابن سعد نے صفحہ ۱۱۸ پر لکھا ہے کہ عبدالمطلب نے مرتے وقت ابو طالب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کرنے کی وصیت کی تھی۔ یہی بات تمام محدثین اور مؤرخین اور سیرت نگاروں نے بالاتفاق لکھی ہے۔ لیکن عباسی صاحب کی علمی خیانت کا حال یہ ہے کہ عبدالمطلب کی جس وصیت کا واقعہ وہ ابن سعد سے نقل کر رہے ہیں وہ دراصل یہ ہے کہ عبدالمطلب نے بنی خزاعہ سے حلف کا جو معاہدہ کیا تھا اس کے بارے میں اپنے بیٹے زبیر کو وصیت کی تھی کہ اس عہد و پیمان کو نباہنا۔ پھر زبیر نے ابو طالب کو اور ابو طالب نے عباس بن عبدالمطلب کو اسی چیز کی وصیت کی۔

ابو جعفر محمد بن حبیب جس کا حوالہ انہوں نے دیا ہے اس نے عبدالمطلب کے بعد منصب ریاست پر زبیر کی جانشینی کا ذکر کیا ہے۔ یہ نہیں لکھا کہ حضورؐ کی خبر گیری ان کے سپرد کی گئی تھی۔ انہی دو نمونوں سے آپ عباسی صاحب کی صداقت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

# مطبوعات

| آمریت | مترجم:۔ عنصر صابری صاحب |
|---|---|

طباعت:۔ عمدہ۔

ضخامت:۔ ۱۲۸ صفحات قیمت:۔ -/۶ روپے

ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ مطبوعاتِ سلیمانی، راحت مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔

آج سے کم و بیش اڑھائی سو سال پیشتر اٹلی کے ایک مصنف نے ایک کتاب " ڈیلا امیڈرے" تحریر کی تھی جس میں آمریت کے خدوخال بیان کیے گئے تھے۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کے تراجم مختلف زبانوں میں ہونے شروع ہو گئے۔ آج دنیا کی شاید ہی کوئی معروف زبان ایسی ہو جس میں اس کتاب کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ زیرِ تبصرہ کتاب " آمریت" اسی " ڈیلا امیڈرے" کا اُردو ترجمہ ہے۔

آمریت ایک ہمہ گیر اور کلیت پسند طرزِ حکومت کا نام ہے۔ اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہوتا ہے اور اس کی گرفت انسانی سرگرمیوں پر بہت سخت ہوتی ہے۔ آمریت نہ صرف سیاسی سرگرمیوں اور اداروں کو اپنے آہنی شکنجوں میں جکڑ کر رکھتی ہے بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو اپنا تابع مہمل بنا دیتی ہے، حتیٰ کہ ایک فرد کے افکار و نظریات بھی اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہوتے۔ زیرِ نظر کتاب میں آمریت کی اسی ہمہ گیری اور کلیت پسندی کا ذکر نہایت دلنشیں پیرایہ میں کیا گیا ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے آمریت کے بارے میں جو پہلا تاثر پیدا ہوتا ہے اس کے مطابق ایک آمر مذہب و اخلاق کی مٹی پلید کرتا ہے، علم و دانش کا راستہ روکتا ہے، باعزت اور صاحبِ شعور افراد کی عزتِ نفس کو مجروح کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے، حکومت کے ذرائع و وسائل سے لوگوں کے ضمیر اور ایمان کا سودا کرتا ہے۔ وہ اپنے حاشیہ برداروں کو ہر قسم کی مراعات دیتا ہے مگر عوام الناس کو اپنا غلام بنا کر انہیں حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ آمریت کے تمام خدوخال اس کتاب میں ایک قاری کو بے نقاب نظر آنے لگتے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ ان لوگوں کو خاص طور پر کرنا چاہیے جو اس باطل نظریہ کے شکار ہیں کہ حکومت

خواہ کسی طرز کی ہو اور حکمران کوئی بھی فرد ہو عام لوگوں کو تو صرف روٹی کمانی ہے۔

ترجمہ کی زبان نہایت سادہ اور رواں ہے اور ادبی چاشنی بھی موجود ہے۔ کتاب کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ بعض تراکیب البتہ ایسی ہیں جو ذہن کو کھٹکتی ہیں مثلاً قبیلائی نظام ص ۱۱۵

---

| ارمغانِ نعت<br>چودہ سو سالہ نعتوں کا انتخاب | مُرتبہ: شفیق بریلوی۔<br>شائع کردہ: مرکزِ علومِ اسلامیہ۔ ۵ گارڈن۔ کراچی۔ |
| --- | --- |

ضخامت: ۳۶۰ - جلد دیدہ زیب و پختہ۔ کاغذ، طباعت، کتابت، عمدہ

قیمت: -/۲۵ روپے

مؤقر مجلّہ "خاتون پاکستان" نے متعدد رسولؐ نمبر پیش کر کے اس سے قبل بھی زیرِ نظر موضوع کی ایک جھلک پیش کی تھی مگر اس وقت معاملہ زیادہ تر دماغ سے رہتا تھا اب جناب شفیق بریلوی نے مجموعہ زیرِ نظر کے ذریعہ وہ راستہ اختیار کیا ہے جو دل کا راستہ ہے جہاں عقل کے پر جلتے ہیں اور جہاں محبت ہی محبت ہے، عشق ہی عشق ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ نعت چودہ سو برس پر پھیلا ہوا ہے اور اس شان سے کہ ہدیۂ نعت پیش کرنے والوں میں خلفائے راشدین، اہل بیت رسول، اولیاء کرام، بادشاہ و شہنشاہ سبھی شامل ہیں۔ عربی، فارسی اور اردو نعتوں کے ساتھ پنجابی، پشتو اور سندھی نعتیں بھی موجود ہیں، اور مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلموں کا ہدیۂ نعت بھی شریک ہے اور نعت کے موضوع بھی اتنے پھیلے ہوئے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور ہر کوئی اپنے رنگ میں عقیدت کے پھول پیش کرتا نظر آتا ہے۔ ان تمام خوبیوں نے "ارمغانِ نعت" کو اپنے موضوع پر خاصے کی چیز بلکہ شاہکار بنا کر رکھ دیا ہے اور امید ہے کہ محبانِ رسولؐ اس چمنستان نعت سے کما حقہ، استفادہ کریں گے۔

شروع میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی کے قلم سے "نعتِ شہِ کونین" کے عنوان سے ایک مختصر مگر مبسوط و جامع مقالہ درج ہے جو عربی، فارسی، ترکی اور اردو نعت پر فاضل مقالہ نگار کے وسیع مطالعہ کا پتہ دیتا ہے۔ تاہم اگر ۱۹۳۵ء سے لے کر اب تک کے جدید اور ترقی پسند ادب پر بھی نظر رہتی تو حضورؐ پاک کا یہ معجزہ

سامنے آتا کہ ربع صدی قبل جو لوگ لینن کو عظیم باپ کہہ کر اُس کے حضور "عقیدتوں کے شفق رنگ پھول" پیش کرتے تھے وہ بھی اب نعت رسول ؐ کہہ رہے ہیں۔ کاش یہ مجموعہ فکر و نظر کی نئی راہیں کھولے اور اس میں درج اجمال پر تفصیلی تنقید کا باب کھل جائے۔

---

**قرآن میں سائنسی رموز** از ڈاکٹر اسد اللہ خان (ہومیوپیتھ) اکبر روڈ (عقب فریر مارکیٹ) کراچی ۱

طباعت کتابت - بہت اچھی - جلد پختہ

صفحات: ۲۷۰ قیمت پندرہ روپے ۱۵/-

یہ تالیف فاضل مؤلف نے اِس جذبہ سے پیش کی ہے کہ "سائنس دان اپنی سائنسی تحقیق کے لیے کلام مجید سے فیوض حاصل کریں"۔ ان کی رائے میں سائنس دان حضرات اپنے مقالات میں قرآنی آیات سے استدلال تو کرتے ہیں مگر کلام مجید کی آیات کو بنیاد بنا کر تحقیق کا کام ابھی شروع نہیں کر پائے۔ اِس سلسلہ میں اپنی مثال انہوں نے پیش کی ہے کہ "آیہ پاک فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ کی شرح کرنے کی تمہید باندھی تو طریقۂ علاج میں انقلاب نظر آنے لگا" اور آسان علاج (علاج بالغذا) کے عنوان سے ایک کتاب انہوں نے پیش کی۔ سائنسی رموز سے اُن کی مراد اس طرح کے موضوعات ہیں "مخلوق کے لیے زمین کا وجود میں لایا جانا، دودھ، شہد، طبی غذاؤں کی فراہمی، خود انسان کی پیدائش، اس کو نطق بخشا جانا، وغیرہ"۔ اِسی اعتبار سے قرآن پاک کی مختلف آیات اکٹھی کی گئی ہیں اور ترجمہ آیات کے بعد ان کا "سائنسی تجزیہ" بھی دیا گیا ہے جس کی اساس ترجمۂ آیات پر ہی ہے اور اس میں مزید حاشیہ آرائی نہیں کی گئی۔ آخر میں مضامین زیر بحث کا ایک مبسوط اشاریہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

ہر چند کہ "سائنسی رموز" اور "سائنسی تجزیہ" پر کچھ کہنے کی گنجائش ہے لیکن موجودہ حالت میں سائنس اور دیگر علوم کے طالب علم اور عام قاری بھی قرآن پاک کو سمجھنے کے سلسلہ میں زیر نظر تالیف سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ تالیف زیر نظر اور اشاریہ کی ترتیب و تیاری میں بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے۔

---

(بقیہ اشارات) بے گناہ انسانوں کو بھیانک مظالم کا نشانہ ستم بنانے کے بعد اس نظام کو روس کے اندر مسلط کیا اگرچہ اب بھی وہاں بقول مارکس کے سچے پرستاروں کے حقیقی اشتراکیت موجود نہیں بلکہ بعض کے نزدیک جن میں چین کے اشتراکی پیش پیش ہیں، سامراجی نظام اپنی ساری قہرمانیوں کے ساتھ پروان چڑھا ہے لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ روس کو اشتراکی تجربہ گاہ کی حیثیت سے اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ اس تجربے کی کامیابیوں کے افسانے جب ہم خود اشتراکیوں کی زبان سے سنتے ہیں تو ہمارے سامنے لے دے کر صرف یہی چند پہلو نمایاں ہو کر آتے ہیں کہ وہاں عوام کا معیار زندگی کسی حد تک بلند ہو گیا ہے گو وہ بعض سرمایہ دارانہ ممالک سے ابھی کافی پست ہے یا وہاں لوگوں کو کسی قدر معاشی تحفظ حاصل ہوا ہے یا یہ ملک جنگی نقطہ نظر سے امریکہ کا کامیاب حریف ثابت ہو سکتا ہے یا سائنس اور صنعیات میں یہاں کافی ترقی ہوئی ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح اور درست ہی سہی لیکن یہ دیکھیے کہ اس معاشرتی تجربہ میں انسانیت کو کتنا عظیم نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔

نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے لیکن ابھی یہ تجربہ بالکل اپنے ابتدائی مراحل میں ہے کیونکہ جن فوائد کے حصول کی خاطر اسے شروع کیا گیا تھا ان میں سے اس وقت تک کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ روسی تجربہ گاہ میں نہ تو ریاست کا وجود ختم ہوا ہے اور نہ استحصال و استبداد کی بیخ کنی ہوئی ہے۔ معاشرے میں طبقاتی تقسیم کے وہی روح فرسا مناظر سامنے آ رہے ہیں جو بالعموم غیر اشتراکی ممالک میں دیکھے جاتے ہیں۔ جہاں تک اس کی خارجی پالیسی کا تعلق ہے اس میں بھی ہر قدم پر ناپاک سامراجی عزائم ہی جھلکتے ہیں۔ پھر جو ممالک آزادی اور اجتماعی عدل کے اس علمبردار کے زیر اثر آئے ہیں اُن کا جو حشر ہوا ہے وہ کسی اعتبار سے بھی اس حشر سے مختلف نہیں جو استعماری ممالک نے اپنی نوآبادیوں کے ساتھ کیا ہے۔ روس کے اندر اس اشتراکی تجربے کی رفتار، نہج اور اس کے نتائج دیکھ کر یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ یہ تجربہ طویل تو ضرور ہو گا اور بعض سرپھرے دوسرے ممالک میں بھی دہرانے کی کوشش کریں گے اور اس کی وجہ سے نوع انسانی کا ایک بہت بڑا حصہ اَن گنت مصائب میں مبتلا ہو گا لیکن جس طرح کسی انسان کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جو سورج آج غروب ہو رہا ہے وہ کل ضرور طلوع ہو گا اس سے زیادہ وثوق کے ساتھ اس اشتراکی تجربے کی ناکامی کے متعلق پیشگوئی کی جا سکتی ہے کیونکہ یہ تجربہ نہ صرف فطرتِ انسانی کے خلاف گہری سازش ہے بلکہ اس خالق کے خلاف بھی بغاوت ہے جو حیاتِ انسانی کے مسائل کو محدود عقل رکھنے والے انسانوں سے بہتر جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکیت

کی جس منزلِ مقصود کی مارکس نے نشاندہی کی تھی، اشتراکی ممالک اُس سے نزدیک تر ہونے کے بجائے دُور ہٹتے جا رہے ہیں۔ اشتراکیت اور روس کے ناقدین کی تو بات جانے دیجیے۔ اُن کے علمبرداروں اور بہی خواہوں کی اگر آرا معلوم کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس تجربے کی کامرانیاں صرف زیبِ داستان کی حیثیت رکھتی ہیں۔ روس کے عوام اس تجربہ کی چکی میں بُری طرح پسنے کے بعد اُسی طرح مفلوک الحال ہیں جس طرح کہ غیر اشتراکی ممالک کے ستم زدہ لوگ۔ باقی جہاں تک "برق و بخارات" کے معاملے میں روس کی ترقی کا پرچار کر کے اسے اشتراکی نظام کی کامیابی کی دلیل ٹھیرایا جاتا ہے تو یہ سراسر منطقی مغالطہ ہے۔ اگر روس کی یہ سائنسی ترقی محض اشتراکیت کی رہینِ منت ہے تو پھر امریکہ، فرانس، برطانیہ اور جاپان جہاں سرمایہ دارانہ نظام کا تسلط ہے وہاں جدید صنعت کا نام و نشان نہ ملنا چاہیے۔ لیکن یہ سارے ممالک صنعتیاتی اعتبار سے روس کے مقابلہ میں خاصے ترقی یافتہ ہیں۔ روس کی ترقی اشتراکی نظام کی رہینِ منت نہیں بلکہ اس جوش و ولولہ کا نتیجہ ہے جو کوئی قیادت کسی قوم کے اندر پیدا کر دیتی ہے۔ دنیا کے متعدد قائدین نے اپنے اخلاص اور حسنِ تدبر سے کام لے کر اشتراکیت کی راہ سے نہیں بلکہ بعض دوسری راہوں سے اپنی اپنی قوموں کو بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ انسانیت کے بعض بہی خواہوں نے قوموں کی اخلاقی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور اس بنیاد پر ہی ان کے لیے اجتماعی نظام تجویز کیے مگر اخلاقی اصلاح کے اس کام میں افراد کے اندر جو حرکت اور حرارت پیدا ہوئی اس سے نہ صرف اُن کی اخلاقی اور روحانی حالت سدھری بلکہ ایک ایسا اجتماعی ماحول بھی معرضِ وجود میں آیا جس میں ان کے لیے مادی ترقی کی تحریک پیدا ہوئی۔ اشتراکیت کے لیے آج بعض انسانوں کے دلوں میں جو کشش ہے وہ اس نظام کی وجہ سے نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظام سے بیزاری کا نتیجہ ہے۔ لیکن خود اشتراکی نظام کے متعلق جو خوفناک بیزاری پیدا ہوگی اس کا مظاہرہ اس وقت ہوگا جب اشتراکیت تجربات کے سارے مراحل سے گذر کر زبانِ حال سے اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگی اور یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس کا یہ اعتراف سرمایہ دارانہ جمہوریت سے زیادہ واضح ہوگا۔

---

مگر سوچنے والی بات یہ ہے کہ اشتراکیت کی اس ناکامی سے یہ بات تو کھل کر سامنے آجائے گی کہ یہ نظام چونکہ غلط بنیادوں پر استوار ہوا ہے اس لیے اس کے علمبرداروں کی مجنونانہ سرگرمیوں کے باوجود یہ انسانیت کی فوز و فلاح کا ذریعہ نہیں بن سکا اور انسانوں کی عظیم اکثریت اس کڑی آزمائش سے گذرنے کے بعد بھی اسی

کس مپرسی کا شکار ہے جس کا وہ دور سرمایہ داری میں شکار تھی۔ لیکن کیا ان تلخ حقائق کے سامنے آجانے سے اُن بے پناہ نقصانات کی تلافی ہوسکتی ہے جو اشتراکیت کے اس تجربے کی وجہ سے انسانیت کو اُٹھانا پڑے ہیں۔ آخر اُن لاکھوں بلکہ کروڑوں بے گناہ انسانوں کا خون کن لوگوں کی گردن پر ڈالا جائے گا جو اس ناکام معاشرتی تجربے میں ہلاک ہونگے ؟ کیا کسی نظام کی ناکامی کے محض اعتراف سے عدل و انصاف کے تقاضے پورے ہوسکتے ہیں ؟

---

ہمارے نزدیک عہدِ حاضر کے انسان کی سب سے بڑی حرماں نصیبی یہ ہے کہ اسے معاشرتی تجربات کی بھٹیوں میں بے دریغ جھونک دیا جاتا ہے اور وہ جب جل کر بالکل راکھ ہو جاتا ہے تو پھر کیمیاگر کے سے انداز میں اپنی ناکامیوں کو چھپانے کے لیے بڑی عیاری کے ساتھ یہ کہا جاتا ہے کہ بس ایک آنچ کی کسر باقی تھی ورنہ سونا تو بنا چاہتا تھا۔ کیمیاگر کا تجربہ اگر ناکام ہوتا ہے تو یہ صرف مال و دولت کا زیاں ہے لیکن جب "معاشرہ گروں" کو اپنے تجربات میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو اس سے پوری انسانیت برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ دنیا پر جب تک مذہب کا تسلط قائم رہا اُس وقت تک چونکہ معاشرت کی بنیاد مضبوط اور اقدارِ حیات کی اساس مستحکم تھی اس لیے انسان کو معاشرتی تجربات کے زیادہ مواقع میسر نہ آتے تھے اور اگر یہ میسر بھی آتے تو ان کے دائرے بڑے محدود ہوتے جس سے انسانی زندگی کو کوئی شدید جھٹکا نہ لگتا۔ لیکن دورِ جدید میں مذہب کی گرفت کمزور ہونے کی وجہ سے چونکہ انسان کے فکری جہاز بے لنگر ہو گئے ہیں اس لیے افکار و نظریات کے طوفان جس طرف چاہتے ہیں اسے بہا کر لے جاتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں اسے ایک دوسرے سے ٹکرا کر غرق کر دیتے ہیں۔

---


## قرآنِ مجید

(انگریزی ترجمہ مع حواشی)

از :- عبدالحمید صدیقی

دوسرا پارہ چھپ کر بازار میں آگیا ہے۔

ھدیہ :- ۱۲/۵۰ روپے۔ مستقل خریداروں کیلیے۔ ۱۰/- روپے

ملنے کا پتہ :

۱- اسلامک بک سنٹر۔ ۱۴- اجیب بنک بلڈنگ، چوک اُردو بازار پوسٹ بکس نمبر ۱۶۲۵- لاہور پاکستان

۲- ادارہ ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور

## ضروری اعلان

ادارہ ترجمان القرآن کے لیے لاہور میں سکونت رکھنے والے ایک اکاؤنٹنٹ کی ضرورت ہے جو اے جی آفس یا کسی اور محکمہ کے ریٹائرڈ شدہ ہوں، نیز کاروباری حساب کتاب سے بخوبی آگاہ ہوں۔ معاوضہ معقول دیا جائے گا۔

ناظم

ادارہ ترجمان القرآن - اچھرہ - لاہور

# صحافت کا آئینہ

ہر روز

حکومت، اپوزیشن اور عوام کو

اُن کی بدلتی ہوئی صورتیں دکھاتا رہتا ہے

اگر کسی کو

اس آئینہ میں اپنی صورت اچھی دکھائی نہ دے

تو بجائے

اسے توڑے نہیں بلکہ

اپنے چہرہ کو خوشنما بنانے کی فکر کرے

جماعت اسلامی پاکستان

# ترجمۂ قرآن مجید

## مع مختصر حواشی

از: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

اِس میں مُصنّف نے قرآنِ حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کردیے ہیں، تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادھا مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کے خلاصے سے فائدہ اُٹھا سکیں

انشاء اللہ مارچ ۷۶ء کے پہلے ہفتے میں

یہ قرآن مجید شائع ہو جائے گا

جو حضرات پیشگی روپے روانہ کردیں گے اُنھیں یہ مُترجم و مُحشّٰی قرآن مجید رقوم کی ترسیل کے مطابق ترتیب وار بھیجا جائے گا

هدیہ قسم اعلیٰ -/۷۵ روپے

هدیہ قسم دوم -/۶۰ روپے

پیشگی رقم ارسال کرنے والے حضرات سے محصول ڈاک نہیں لیا جائے گا

ناظِم اِدارۂ ترجمان القرآن، اِچھرہ-لاہور

فون نمبر: ۴۱۱۰۱۶ — ۴۱۱۰۱۷